شعلۂ ساز

شعلۂ ساز

فراق گورکھپوری

مکتبہ اردو لاہور

طبع اوّل ۱۹۴۵ء

قیمت چار روپے

(تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام چوہدری نذیر احمد چھپکر مکتبۂ اُردو لاہور سے شائع ہوئی)

اُن کے نام :-

جو غزل اور نظم دونوں میں شاعری کی دیوی کو جلوہ گر دیکھتے ہیں

عرضِ مرتّب

اب یہ کیا کہوں کہ شعلۂ ساز کی ترتیب کیلئے میرا انتخاب کیسے ہوا ——— اکثر حضرات کیلئے یہ امر باعثِ حیرت ضرور ہوگا۔ اسلئے کہ وہ اگر مجھے جانتے ہیں تو خالص نظم گو شاعر کی حیثیت سے۔ اُن کے نزدیک اس مجموعے کے سلسلے میں میرا ذوقِ نظر اور حسنِ انتخاب بیرونِ دخلِ نظر ہوگا۔ لیکن میں اس بحث میں پڑنا غیر ضروری سمجھتا ہوں ——— یہی بہت ہے کہ آج سے تقریباً ایک سال پہلے جب شعلۂ ساز کا مسودہ میرے ہاتھوں میں آیا تو مجھے ایک گونہ فخر کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری کا احساس ہوا ——— مجھے معلوم نہیں کہ میں اس ذمہ داری سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکا ہوں ——— میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ حضرتِ فراق کے کلام کو جہاں تک میرا ذوقِ ادب رہنما ہوا میں نے انتہائی کاوش اور ایک سلجھے ہوئے نقاد کی نظر سے دیکھا ہے اور اب یہی کہہ سکتا ہوں کہ شعلۂ ساز ——— مجموعہ ہے میرے انتخاب اور حضرتِ فراق گورکھپوری کے کلام کا ———

اپنے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہونگا۔ اب مجھے اس مجموعے سے متعلق کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ عرض کروں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں قصیدہ گو نہیں میری خوش بختی ہے کہ مجھے ایک ایسے شاعر کے روشناس کرانے کا فرض سونپا گیا ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں ——— ایک رُبع صدی سے بلکہ اس سے بھی کچھ اوپر ان کا کلام ملک کے رسائل میں شائع ہو رہا ہے۔ اس پر تبصرے ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر طلبا میری عمر کو پہنچ چکے ہیں یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری بھی تقریباً میری ہم عمر ہے۔

شاعری زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور زندگی ایک بہت وسیع لفظ ہے ——— ایک لفظ جس میں ایک طرف تو تمام کائنات سمٹ آتی ہے اور دوسری طرف ایک فردِ محض ایک مختصر سی ہستی کا آئینہ نظر آتا ہے ——— ایک ایسا مختصر سا فرد جس کا اس بسیط و عریض زندگی میں وہی درجہ ہے جو صحرا میں ایک ذرّے کا ——— بسا اوقات یہ ذرہ تمام عالمِ صحرا کا احاطہ کر لیتا ہے ——— ایک ایسا ہی ذرہ جسے ہم فراق گورکھپوری کے نام سے موسوم کرتے ہیں ایک زندگی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کی شاعری پر نظر ڈالیں۔ ان محرکات کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے جنہوں نے اسے شاعر بنایا اور شاعر بھی ایک عام شاعر نہیں ایک ایسا شاعر جو زندگی کا ترجمان ہے ——— جس کی عینک سے دیکھتے ہوئے اس لامحدود صحرا کی متنوع کیفیات میں سے بعض بہت نمایاں ہیں اور بعض بہت دھندلی اور مبہم نظر آنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض کا وجود تک نہیں ——— یہ بات محض فراق کے حصے میں نہیں آئی۔ ہر صحیح شاعر جو اپنے وقت کا مصوّر ہے جو اپنے محسوسات اور جذبات کی تصویر کھینچتا ہے اپنے خاص زاویۂ نظر سے دیکھتا چلا آیا ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی فن کار

اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکے گا —— یہ انتخاب یہ خصوصیت آخر کیوں؟ —— اس کی تہ میں پہنچنے کے لئے ہمیں اس شاعر کی زندگی کا مطالعہ کرنا ہوگا —— ٹی۔ ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ ہر شاعر کے ارتقا اور اس کے اسلوب میں تمام تدریجی تغیرات اس کے خارجی ماحول کا نتیجہ ہوتی ہیں —— یہ دیکھنا ہوگا کہ زندگی کی راہ میں فراقؔ نے کون کون سے مراحل طے کئے۔ انہوں نے کہاں کہاں قیام کیا اور تلاش و جستجو کی کن کن منزلوں سے گزرے۔ جہاں تک محض زندگی کے واقعات کا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ وقت نے مجھے حضرت فراقؔ کو قریب سے دیکھنے کے لئے ایک نہایت قلیل وقفہ مرحمت کیا۔ اور اس مختصر سی صحبت میں مجھے جو کچھ حضرت فراقؔ کے بارے میں معلوم ہو سکا اس کے اظہار کی مجھے اجازت نہیں ملی۔ اب لے دے کے میرے سامنے نظموں کا ایک مجموعہ ہے جس کا نام ہے "میری بہترین نظم" اس میں شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی بھی ہیں۔ فراقؔ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ دیکھئے اپنے بارے میں وہ کیا لکھتے ہیں:-

"میری پیدائش شہر گورکھپور میں ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ضلع گورکھپور میں میرا خاندان چار سو برس سے آباد ہے۔ میرے بزرگوں کو شیر شاہ سوری نے پانچ گاؤں اسی ضلع میں دیئے تھے اور ہم لوگ پنچ گاواں کے کائستھ کہلاتے ہیں۔ میرے والد مرحوم منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ گورکھپور میں چوٹی کے وکیل اور ۳۱ برس تک گورکھپور بار کے لیڈر رہے۔ میری تعلیم گھر پر دو چار ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد انگریزی سکول میں ہوئی۔ کالج کی تعلیم الٰہ آباد میں ہوئی۔ شاعری کا چرچا گھر میں تھا اور میری طبیعت میں موزونیت تھی۔ اس لئے شعر کہنے کا شوق تو بچپن ہی سے تھا لیکن ۱۹ برس کی عمر تک مجھ سے شعر نہیں ہوتے تھے۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ اردو غزل کے کئی سو اشعار مجھے بچپن ہی سے یاد تھے لیکن عام طور پر اردو شاعری میں مجھے ایسے لوگوں کا مزاج ملتا تھا جن کا دل کڑا ہے اور جن کے لہجے میں تفکر کم ہے اور جہاں ہے وہاں حلاوت سے خالی۔ اس شاعری میں مجھے دنیا کی پاکیزگی کا احساس بھی کم ملتا تھا۔ یہاں شکوہ اور شکایت کے دفتر باز تھے۔ زیادہ تر ناکام تعیش اور لذتیت کے عناصر اس شاعری پر غالب تھے۔ مادے کی روحانیت اور طہارت کا احساس مفقود تھا۔ اس شاعری میں غم کے احساسِ ذاتی ناکامی کا اظہار تھے اور نشاطیہ اشعار ذاتی یا نفسیاتی خواہشوں کے پورا ہونے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس شاعری میں خیر و برکت کے عناصر مفقود تھے۔ اس میں امرت کی برکھا نہیں ہوتی تھی۔ تو جیسے شعر میں کہنا چاہتا تھا اس کے نمونے ہی مجھے نہیں ملتے تھے وہ "دھونی" یعنی گونج "وہ آواز" نہیں ملتی تھی۔ جو بیک وقت زمین اور آسمان کی آواز ہے' جو یہ بتائے کہ دنیا اور دنیا کی زندگی سے پاکیزہ نہ کوئی خدا ہے نہ مذہب۔ میں ایسی شاعری چاہتا تھا جو روحانیت سے بر تر "کفر" (PAGANISM) کے نغمے سنا سکے ۔

تُو ہی اے دل اب زمانے کو پیامِ کفر دے تُو نے دیکھا بھی ہے اُن آنکھوں کا سحرِ سامری

میں جب بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ چھوڑ کر کانگریس کی تحریک کے سلسلے میں ڈیڑھ برس تک قیدِ فرنگ میں رہا تو کچھ غزلیں کہنے کا موقع ملا۔ جن خوبیوں سے میں نے اردو شاعری کو عام طور پر محروم پایا تھا ان کے علاوہ جو خوبیاں اردو شاعری میں موجود تھیں لیکن جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے تلاش اور نازک احساسات کی ضرورت تھی۔ انہیں بھی مشق اور غور و فکر، سماعی تخیل (ANDITORY-IMAGINATION) کی مدد سے حاصل کرتا رہا۔ لیکن شاعری ایسی کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اشعار میں ایسی روح، ایسی فضا، اور فضا میں ایسی تھرتھراہٹ چاہتا تھا کہ وہ تمام خوبیاں جلوہ گر اور اجاگر ہو جائیں جو اُس قوم کی تہذیب میں ملتی ہیں جس قوم نے راماین، مہابھارت، سیتا، شکنتلا، کرشن، بدھ اور ہندوستان کے قدیم آرٹ اور کلچر کو پیدا کیا۔ اور جس کلچر پر اسلامی اور جدید مغربی تہذیبوں کے اثرات سے اور بھی جلا ہوتی گئی۔ اگر اُن صفات کی کچھ جھلک میرے دس فیصدی اشعار میں ملتی ہے تو میں اپنی کاوشوں اور کوششوں میں شاید ناکام نہیں رہا۔ بہرحال پچیس برس اب میری شاعری کی عمر ہوئی۔ اِس عرصے میں ایم۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا اور لکھنؤ کرسچن کالج کانپور، سناتن دھرم کالج کی ملازمتوں کے بعد اب اپنی گذشتہ درسگاہ یعنی الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کا لکچرار ہوں۔ زیادہ تر میں غزلیں کہتا رہا ہوں۔ نظمیں بھی میں نے کہی ہیں لیکن میری غزلیں لوگوں کو زیادہ متوجہ کر سکی ہیں۔ میں اُس صنفِ سخن کی عظمت اور اس کے بلند امکانات کا قائل ہوں جسے نظم کہتے ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ غزل میں حقیقی احساسات، مشاہدے اور زندگی کے تجربے ظاہر نہیں کئے گئے یا نہیں کئے جا سکتے۔ ہاں اِس اظہارِ حقیقت میں بہت داخلیت اور سمیٹ کی بہت جامعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

دوسرا مجموعہ اوراقِ گُل ہے جو حال ہی میں باصورت شائع ہوا۔ اس میں سرگذشت کے عنوان سے حضرتِ فراق کے خد و خال کے بارے میں مرتب فرماتے ہیں "فراق سانولے رنگ کے چُست و تندرست، مذہبی قیود و تعصبات سے آزاد، روشن خیال اور ہنس مکھ انسان ہیں" —— "سب سے پہلی غزل ۱۹۱۶ء میں کہی۔ جبکہ بی۔ اے میں تعلیم پا رہے تھے" —— اور خود فراق کا ارشاد ہے "میں زیادہ تر امیر مینائی کا متبع ہوں اور چونکہ عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ناصری، مولانا حسرت، اصغر، یگانہ اور علامہ اقبال کے کلام کو اصلاحِ خیال کی نظر سے دیکھا ہے اِس لئے اُن تاثرات سے بھی کلام رنگیں ہے۔"

آپ حضرتِ فراق سے مل چکے —— اِس سانولے سلونے شاعر کا تصور کر چکے —— شاید آپ نے ان کی تصویر بھی کہیں دیکھی ہو —— مجھے تو ان کے چہرے میں ایک مردانہ حسن، پاکیزگی اور جاذبیت، اور آنکھوں میں ایک خاص چمک اور

کیفیت نظر آئی ہے جو ان کے اکثر اشعار میں ملتی ہے ـــــ ممکن ہے کہ ان باتوں نے تصویر کے سانچے میں ڈھلنے سے انکار کر دیا ہو۔ اور آپ کی ذہنی تصویر میرے تصور سے ہم آہنگ نہ ہوسکی ہو۔

فراق نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ لکھنؤ سے قریب تھا اور زندگی سے دور ـــــ اس میں تصنع اور آورد کے علاوہ رعایت لفظی، ایہام گوئی، صنائع بدائع، موقع بے موقع تشبیہات اور استعارات، مبتذل مضامین اور تنگ بندی کی حد تک قافیہ پیمائی تھی، وہاں ایسے اشعار کو آسمان پر چڑھایا جاتا تھا ؎

بوسہ مانگا تو اس نے مثلِ پتنگ   بیچ سے کاٹ دی ہماری بات   (امانت)

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو   نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل   (ناسخ)

لیکن سلاست اور روانی کے اعتبار سے لکھنؤ کی شاعری کسی شاعری سے پیچھے نہیں تھی، اسی سلاست آورد رعایتِ لفظی اور بے موقع تشبیہات کی بارش نے لکھنؤ کو مرثیہ نگاری میں بے بدل بنا دیا اور غالب جیسا قادر الکلام شاعر انیس کے مرثیے کا جواب دینے بیٹھا تو پانچ بے تکے بندوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس ماحول کے ساتھ ساتھ فراق کو ایک خوش فکر شاعر باپ کی گود میسر آئی جسے نہ صرف اردو ادب پر دسترس حاصل تھی بلکہ انگریزی ادب سے پوری طرح متعارف تھا۔ اس پر فراق کی انگریزی تعلیم ـــــ لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ لکھنوی شاعری کا چسکا فراق کو ایسا لگا کہ وہ تقریباً ۲۰ سال شعر کہنے کے بعد بھی کوئی خاص چیز پیش نہ کر سکے۔ دور کی بات نہیں ۱۹۳۶ء میں فراق رنگِ مصحفی کو زندہ کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک غزل کے شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

لے کے جب ناز سے انگڑائی وہ بستر سے اٹھا
فتنۂ صبحِ قیامت بھی برابر سے اٹھا

یہ اسی فراق کا شعر ہے جو اسی غزل میں جب آپ میں آتا ہے تو یہ بھی کہتا ہے ؎

مستی و ہوش تو ساقی فقط افسانے ہیں
یہ حجابات بھی اب بادہ و ساغر سے اٹھا

فطری ذوقِ سخن کی راہ میں تمام مراحل آسان ہو جاتے ہیں، یہی فراق کے ساتھ ہوا۔ وہ قدما کے رستے پر چلتے چلتے اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے سینے میں ملک اور قوم کا درد پیدا ہوا ـــــ انہوں نے آئی۔ سی۔ ایس۔ اور پی۔ سی۔ ایس بننا قبول نہ کیا بلکہ جیل کا رخ کیا ـــــ کیوں؟ ـــــ وہ اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے پر مجبور تھے ـــــ کس لئے؟ ـــــ ان سوالات کے جواب کے لئے ہمیں ان کی زندگی کے اوراق پر نظر ڈالنا ہوگی۔ ۱۹۱۵ء یا ۱۶ء میں پہلی غزل کہی۔ اسی زمانے

میں اُن کی شادی ہوئی ——— اُس وقت وہ بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے ——— ایک ایسا نوجوان جو لکھنوی شاعری میں پرورش پا رہا تھا۔ ایک ناکام شادی کی چوٹ برداشت نہ کر سکا ——— اس کے جمالیاتی تصور کو ٹھیس پہنچی لیکن وہ لب سیے ہوئے سب کچھ برداشت کر گئے ؎

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں

شادی ہوئی اور عمر بھر کے لئے ایک تیز خلش اُن کے دل میں جاگزیں ہو گئی ——— اسی خلش نے انہیں شعر کہنے پر اُکسایا لیکن تشفی نہ ہوئی ——— اُنہوں نے خودکشی کرنا چاہی لیکن یہ بھی نہ ہو سکا ——— اپنے درد سے انہیں قوم کے درد کا احساس ہوا ——— بقولِ ڈاکٹر فرائڈ ہماری وطن پرستی کا جذبہ ہماری اپنی تلخیوں اور ناکامیوں کی پیداوار ہی نہیں آئینہ دار بھی ہوتا ہے ——— یہ تمام مصیبتیں جو اُنہوں نے جان بوجھ کر خریدی تھیں۔ اُن کے تخیل کے پس منظر میں نمایاں ہو گئیں۔ اور اُن کی تخلیق شعری میں تقلید کے باوجود دیانتداری کا عکس نظر آنے لگا۔ یہ زمانہ اگرچہ اُن کے لئے مشق کی نوعیت رکھتا ہے۔ لیکن اس تمام دور میں وہ اپنی لکھنویت سے آزاد نہ ہو سکنے کے باوصف اپنے جذبات کے ترجمان تھے ۱۹۲۵ء کی ایک غزل کے چند شعر دیکھئے ؎

فراقؔ دوڑ گئی روح سی زمانے میں — کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست! — وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

میں سمجھتا ہوں کہ آخری شعر اُن کی زندگی کی تاریخ میں سنگِ میل کا مقام رکھتا ہے۔ زندگی کی ایک زبردست ناکامی نے انہیں خود پرستی کی دعوت دی اور وہ بھی اس وقت جب اُنہیں یہ احساس ہوا کہ غمِ روزگار سے غمِ عشق کہیں بہتر ہے ——— وہ جان گئے کہ زندگی سے فرار کے لئے سیاسیات نہیں شاعری ان کی طبیعت اور فطرت کے مطابق ہے ———

اقبال کی ترجمانیٔ قوم و ملت بھی کسی ایسی ہی چوٹ کی پیداوار ہے۔ اُس کی نظروں میں کوئی ایسا گناہ تھا جس کے کفارے کے لئے دامنِ رسول میں جگہ پانے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ امتِ رسول کی تاریخ مرتب کرنے میں فلسفی بن کر کھو گیا ——— اسکے مستقبل پر غور کرنے لگا ——— اُسے اُس خودی اور خودداری کا درس دینے لگا۔ جس کی کمی اُس خاص انتخاب کی بنا پر وہ اپنی ذات میں محسوس کر رہا تھا ——— جوشؔ بھی کسی ایسے ہی انتخاب سے پناہ ڈھونڈنے کیلئے پہلے امام حسینؓ کے شیدائی اور بعد میں خدا سے

باغی ہو گیا ــــ لیکن فراق اِن آلائشوں سے پاک تھے۔ وہ ایک معصوم اور سادہ لیکن یک نظر زندگی کے حامل تھے اور ہیں ــ معصومیت سے میری مراد یہ ہے کہ اُن کا ذہن اُن کی عملی زندگی سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اسی لئے فراق کی ناکامیاں انہیں ترجمانِ حقیقت نہ بنا سکیں۔ بلکہ وہ نقادِ حیات کی حیثیت اختیار کر گئے۔ چنانچہ حضرت نیاز فتحپوری فرماتے ہیں: "وہ شعر نہیں کہتے۔ زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتے ہیں . . . . اتنا لطیف اور عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔" اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ حیثیت انہیں کیسے نصیب ہوئی۔

زندگی کی قنوطیت نے انہیں فانی کی طرف مائل کر دیا۔ بیس برس کی عمر میں وہ آگرہ جیل میں پہلی دفعہ فانی کی شاعری سے متعارف ہوئے ــــ فانی جس کا دوسرا نام دقیق شاعری سے بغاوت ہے ــــ جس وقت فانی یہ شعر کہہ رہے تھے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اُس وقت داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ شاعر محض جذباتی تھے۔ انہیں حقائق سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا ــــ دوسری طرف اکبر الہ آبادی تھے جو ہنسانا جانتے تھے اور طنز کے تیز نشتر چلاتے تھے ــــ اور ادھر فانی۔

اغلباً حضرت فراق بھی یہ نہیں جانتے کہ فانی نے اُن کے یاسیت کے پہلو کو کس قدر تسکین دی ہے جس طرح المیہ ڈرامے ہماری اپنی تلخیوں کے غم کو آسودہ کر دیتے ہیں ہم دوسروں کے درد سے اپنے درد کی پیاس بجھا لیتے ہیں بعینہٖ اسی طرح فراق نے فانی کی شاعری میں اپنی تپشِ غم کو ٹھنڈا کیا۔ انہیں ایک ایسا فن کار ملا جو ان کی اپنی تلخیوں کا ترجمان تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاعری کی شاہراہ پر فانی آڑے نہ آجاتے تو فراق قنوطیت کے سب سے بڑے علمبردار ہوتے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ فراق نے یاس کا پہلو ترک کر دیا۔ نہیں بلکہ جہاں فانی کا غم ذاتی تھا۔ وہاں فراق نے کائناتی غم کی ترجمانی کی۔ ان کے غم میں ایک وسعت، ایک ہمہ گیری ہے ــــ وہ کہتے ہیں ؎

کبھی سازِ طرب سن کے بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
نوائے شاعرِ فطرت الم کی داستاں کیوں ہو

لیکن اس کے باوجود اُن کی شاعری میں الم کی داستاں موجود ہے ــــ اور اُن کے شاعرِ فطرت ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے ــــ فراق نے غم کو اُس نظر سے دیکھا ہے جس میں مشرق و مغرب کی تمیز نہیں جو آفاق گیر ہے۔

وہ ترا غم ہو یا غمِ آفاق — شمع سی دل میں جھلملاتی تھی

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ فانی سے متاثر ہوئے۔ فانی کا شعر ہے۔

مجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر — بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

اور فراقؔ کہتے ہیں ؎

غم و خوشی میں ترے حسنِ بے پناہ کی خیر — خراب حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

ظاہر ہے کہ یہ حسنِ بے پناہ کی خیر، تیرِ بے پناہ کی خیر سے مستعار ہے۔ ایک ہی کیا وہ ہر اچھے شعر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اُن کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ یہ شعر بھی انہیں کا ہوتا تو بہتر تھا۔ اس خواہش میں کوئی برائی نہیں۔

عزیز لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں — اِدھر آؤ تم کو گلے سے لگالیں

اور فراقؔ کہتے ہیں ؎

کچھ ہم بھی تو حوصلے نکالیں — آؤ تمہیں سینے سے لگالیں

اسی طرح کئی مقامات پر فانیؔ اور دوسرے شعرا کی صدائے بازگشت ملے گی۔ میرا خیال ہے کہ عصرِ حاضر کے شعرا میں فراقؔ فانیؔ سے زیادہ قریب ہیں۔ فراقؔ خود فرماتے ہیں:۔

"فانی کے شعر اب بھی نشتر کی طرح میرے دل میں اُتر جاتے تھے لیکن میری بھی ایک وجدانیت بن چکی تھی اس لئے ع

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب

والی بات تو فانی کے کلام سے اب بھی ہوتی تھی ضرور ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔ پھر بھی اس "قریب" میں بعید ہونے کا بھی کچھ احساس ہونے لگا۔ میں بھی دکھی آدمی ہوں لیکن میرا دل اسی عنوان اور انداز سے نہیں دُکھتا جس عنوان اور انداز سے فانی کا دل دکھتا تھا غالب نے کیوں کہا ع — فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نالہ بھی پابندِ لَے نہیں۔ اپنا اپنا رونا، اپنا اپنا ہنسنا"

چنانچہ اس تاثر پر بھی ایک قید ہے اور یہ کہ یہ تاثر ۱۹۳۷ء کے بعد شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور یہی نہیں فراقؔ نے تمام تاثرات سے منہ موڑ کر اپنے مقام کا رخ کیا۔ یہاں اگر میں ٹراٹسکی کے چند جملے دہرادوں تو میرے اس خیال کی تائید ہو سکے گی۔

"فنی تخلیق ہمیشہ سے ایک الجھا ہوا تغیر رہا ہے جس سے پرانی روایات نئے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ اور اس کا باعث وہ تاثرات ہیں جن کی تعمیر غیر ادبی، خارجی زندگی سے ہوتی ہے۔ اپنے اس وسیع تصور کے ساتھ "ادب ایک خادم ہے۔ یہ ایک خود رو عنصر نہیں جو اپنے خون پر خود پلتا ہو۔ بلکہ ایک ایسے سماجی انسان کا عمل ہے جو اپنی زندگی اور ماحول کی ناقابلِ شکست زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔"

؎ یہ شعر میں نے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ (مظفر)

۱۹۳۶ء میں فراقؔ ایک ایسے سانحہ سے دوچار ہوئے جس سے اُن کی زندگی ایک نئے افق کی طرف چل پڑی۔ اسی زمانے میں انھیں ایک ایسے درد سے سابقہ پڑا جو حد سے گزر کر دوا بن گیا۔ مجھے اس سانحے کے اظہار کی اجازت نہیں — مجبور ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ سانحہ ایک ایسی دائمی دُوری سے مترادف ہے جس کے بارے میں فراقؔ کہتے ہیں:-

شبِ فرقت کے سناٹوں سے اکثر   صدا آتی ہے، میں تجھ سے کہاں دُور

زمانہ چھُٹتا جاتا ہے نظر سے   لئے جاتی ہے یادِ رفتگاں دُور

قفس والوں کی بھی کیا زندگی ہے   چمن دُور، آشیاں دور، آسماں دُور   ۱۹۳۷ء

اس زمانے کے بعد اُن کی شاعری میں شعور اور لاشعور کی نمود، کائناتی حُسن اور ذاتی جمالیاتی تصوّرات کا عکس، لامحدود داخلیت کا پرتو، کائنات سے ہم آہنگی کا احساس، بے پناہ قلبی واردات کا آئینہ نظر آتا ہے۔ یہی نہیں انھوں نے غزل میں نئے الفاظ داخل کئے۔ بحور و قوافی سے متعلق ان کا اجتہاد بھی اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں ترقی پسندی سے اور اس سے، جو کچھ مراد لی جاتی ہے، کہیں زیادہ ان کی زندگی اور مطالعہ اس سب کچھ کا ذمہ دار ہے انھوں نے غزل کے قدیم روایاتی فلسفے اور تصوّف میں نئے فلسفے اور تخیّل کا خون داخل کیا وقت کے سلسلے میں ہمیشہ سے تغیّر کو اہمیت دی جاتی رہی چنانچہ اقبال کہتے ہیں ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں   ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

اور حافظ کا یہ شعر ؎

میانِ لالہ و گل خواستم کہ مے نوشم   ز شیشہ تا بہ قدح ریختم، بہار گذشت

اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِس تصوّر پر کوئی اضافہ ممکن نہیں لیکن فراقؔ کا یہ شعر دیکھئے اور اس کی حیرت انگیز نئی وسعتوں پر غور کیجئے ؎

بس اک تسلسلِ تغیّرِ حال قائم ہے   نصیبِ عشق فنا و دوام بھی تو نہیں   (۱۹۳۷)

وقت یا تصوّر اردو شاعری کے لئے اچھوتا اور یہ شعر ابدیت کا حامل ہے۔

فراقؔ خود کہتے ہیں "میں ۱۹۴۲ء سے اب تک بہت کچھ بن بگڑ چکا ہوں اور شاید بدل بھی چکا ہوں، شہیدِ شعر سے شہیدِ شاعری یا مجروحِ شاعری تو ہو ہی چکا ہوں اور یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ شاعر ہونے کی مجھے بہت مہنگی قیمت بھی دینی پڑتی ہے۔ خونِ جگر کھانے کے معنوں میں نہیں بلکہ اُن معنوں میں کہ وجدانی شخصیت متعیّن اور محدود سی ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے کلام سے شاعر بمقابلہ دوسرے پڑھنے والوں کے بیک وقت زیادہ اور کم متاثر ہو پاتا ہے۔ میرا بھی

کچھ ایسا ہی حال ہوا۔ شاعری میں میرا رنگِ طبیعت جیسے جیسے نکھرتا گیا۔ اس میں ایک انفرادیت آتی گئی۔ اپنی پہلی بھولی بھالی سپردگی میں کھو بیٹھا۔"

آیئے اب ہم ان کی تدریجی نشو و نما کا مطالعہ کریں :۔

ایک تصویرِ بہشتِ وصال کی رات   آپ کے لطفِ انتہائی کی
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں   تُو نے تو خیر بے وفائی کی   ۱۹۲۲ء

نشۂ صد جام کیفِ انتظارِ یار تھا   ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغرِ سرشار تھا
دل دکھے روتے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست   خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا   ۱۹۲۲

آج افسردہ فضا بوئے کفن دیتی ہے   منہ دھواں ہے مری شامِ شبِ تنہائی کا
ہم نے بھی موڑ لیا منہ دلِ سوزاں سے فراق   کون ہوتا ہے چراغِ شبِ تنہائی کا   ۱۹۲۳

آگے ترے کسی سے کیا کیا شکایتیں تھیں   منہ دیکھ کر کسی کا اللہ رہ گیا ہوں
محشر میں ساتھ میرا اب چھوڑتے نہیں ہیں   اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں   ۱۹۲۴

دھوکا کھایا ہوگا نظر نے دل کو وہم ہوا ہوگا   تجھ کو دیکھا ہوگا کسی نے تجھ کو کیا دیکھا ہوگا
دل کا چھالا پھوٹ چلا تھا ہجر کی گھڑیاں آخر تھیں   کیسی صبح رہی ہوگی جب یہ تارا ٹوٹا ہوگا   ۱۹۲۵

نہ وہ رنگِ نرگسِ آشنا، نہ وہ دوستی کا چلن رہا   رہی حسن کی نہ ہی شوخیاں، نہ ہی دورِ چرخِ کہن رہا
سرِ راہِ منزلِ عاشقی بڑھے کاروانِ عدم کہ اب   نہ کشاکشِ غمِ زندگی نہ وبالِ جامۂ تن رہا   ۱۹۲۷

کیا فغاں کیا اشکِ غم کیا نالہ مجھ ناشاد کا   تم نہ جب تک دل دکھاؤ لطف کیا فریاد کا
ہم کو مٹنا ہے تو پھر تجھ کو نمایاں کر چلیں   یوں بھی کیا برباد ہونا ہستیِ برباد کا   ۱۹۲۸

ہم کو اپنا ہی اعتبار نہیں   خیر تیرا تو اعتبار کریں
وہ نہ آئیں گے تو فراق ہمیں   کام ہی کیا ہے انتظار کریں   ۱۹۲۹

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں   آج بھی آنکھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں
مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد   ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں   ۱۹۳۱

داستاں در داستاں افسانہ در افسانہ تھا   اک خیالِ دوست شامِ بیکسی کیا کیا نہ تھا
قید بھی، آزاد بھی، آباد بھی، برباد بھی   کیا بتائیں کیا خدا رکھے دلِ دیوانہ تھا   ۱۹۳۳

نہ کیوں ہر آنکھ مایوسِ جمالِ یار ہو جائے   ترا دیدار بھی جب حسرتِ دیدار ہو جائے
نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے   کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے ۱۹۳۴ء
موجِ مے نغمۂ نے نکہتِ گل، کیفِ شباب   سب میں ہیں اُٹھتے ہوئے دردِ محبت کے مزے
سچ ہوا جھوٹ لبِ یار کے اعجاز تو دیکھ   بھر دیئے وعدۂ فردا میں قیامت کے مزے ۱۹۳۵ء
غبارِ کارواں یا نقشِ پائے کارواں ہونا   مری تقدیر میں تھا حسرتِ پس ماندگاں ہونا
مدد اے انقلابِ دائمی اب تک، نہیں آیا   زمیں ہونا زمیں کو، آسماں کو آسماں ہونا ۱۹۳۶ء
فسانۂ نگاہِ اوّلیں سنائے کون   وہ روئداد کوئی روئداد بھی تو نہیں
نثارِ پرسشِ حالِ خراب، کیا کہئے   کہ ایسے میں کوئی افسانہ یاد بھی تو نہیں ۳۷ء
رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں   کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں
لے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق، کیا جانے کہاں   تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں ۳۸ء
قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے   اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں
اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا   یاد تو کیا ہے، مگر بھولا نہیں ۳۹ء
چھڑ گئی اُن آنکھوں کی بات   دنیا میں اب دن ہو کہ رات
جینے والے جی لیں گے   اب نہ ملوگے اچھی بات ۴۰ء

ان اشعار میں تدریجی ارتقا اس قدر نمایاں ہے کہ اب مجھے کسی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۱۹۳۶ء تک کی غزلیں ایک مستقبل کی طرف اشارہ تو ضرور کرتی ہیں لیکن فراق کی مہر اُن پر ثبت نہیں۔ یہ شعر اگر کسی اور سے منسوب کر دئے جائیں تو کوئی خاص ناقابلِ اعتبار بات نظر نہیں آتی۔ البتہ ۳۷ کے بعد فراق ہر لفظ کے پردے سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ہر شعر سے انفرادیت جھلکی پڑتی ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد اُن کے کلام نے جو کروٹیں لیں اُن کا احاطہ میرے امکان میں نہیں۔ اُن کی زندگی موجودہ حالات کی طرح کٹھالی میں رہی ہے اور اب تک ہے ۱۹۴۱ء میں انہوں نے بے قافیہ شاعری کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا (اوراقِ گل مطبوعہ رامپور ۱۹۴۲ء) میں اُن کی اپنی ایک بے قافیہ نظم "آجکل" دہلی میں شائع ہوئی۔ اُن کے تصورات جدید اور متنوع ہیں۔ اُن کے تجربات اور جذبات کہیں کہیں غزل کے ایک شعر میں سمانے سے انکار کرتے ہیں۔ اور وہ انہیں ابہام کی لذت میں سمو کر ہم سے توقع کرتے ہیں کہ ہم اُن کے پسِ منظر کی تصویر کو دیکھ سکیں گے —— آج کے نہایت مشہور اور مقبول شاعر موس مین (HUSEMAN)

کا عقیدہ ہے کہ ہم شاعری سے اُسی وقت زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب وہ پوری طرح سے نہیں بلکہ عمومی اعتبار سے سمجھ میں آئے ——— لیکن ہم اُن حضرات سے متفق نہیں جو ایسے اشعار کے بارے میں یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ یہ اشعار مہمل یا خدانخواستہ بے معنی ہیں ——— ایک ایسے ہی صاحب پروفیسر حامد حسن قادری ہیں جنہوں نے "نیا ادب میری نظر میں" کے عنوان سے حضرتِ فراقؔ کے بارے میں تنقیص فرمائی ہے ——— وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج غالبؔ کے جن اشعار پر ہم سر دُھنتے ہیں۔ انہیں سے متعلق اُس زمانے میں کہا گیا تھا۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
اور پھر روغنِ گل بھینس کے انڈے میں ڈال

یہ حضرات نہیں جانتے کہ ہر آفاق گیر شاعری میں جہاں تجربات اور جذبات کی نمائندگی ہوگی وہاں شاعر کی ذات بھی لپیٹ میں آ جائے گی اور جب تک قاری اُس شاعر کے ذہن اور تصور سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اُن اشعار کے مفہوم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے گا اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکے گا کہ اُن کو اپنے ذہن کے مطابق معانی کا جامہ پہنائے۔ ہر جذبہ جو شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے اپنے ماحول اور مخصوص زاویۂ نگاہ کا حامل ہوتا ہے جس کو سمجھے بغیر ہم شعر کی صحیح داد دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ شاعر نہ تو فوٹوگرافر ہے اور نہ مضمون نگار۔ وہ اپنے جذبات اور تلازمۂ خیال کو کائنات کی سب سے اہم شے گردانتا ہے۔ وہ تمام کائنات کو اپنے نقطۂ نگاہ سے مربوط پاتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ دوسروں کے لئے اچھوتا ہے یا نہیں۔ بسا اوقات ترجمانی کے اعتبار سے وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جو ہر شخص جانتا ہے ——— اور وہ بھی ایسے انداز میں کہ اس میں کسی تخصیصی علامت کا نشان تک نہیں ملتا۔ مثلاً فراقؔ کہتے ہیں ؎

تم بھی سچے ہیں بھی سچا
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے

حقیقت نہایت واضح اور سادہ ہے۔ الفاظ بھی اسی مناسبت سے سادہ ہیں۔ لیکن الفاظ کی تہ میں جو سحر ہے اُس کی تشریح ممکن نہیں۔

میتھیو آرنلڈ کہتا ہے: "شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے خیالات کو زندگی کے ساتھ نہایت حُسن اور صداقت سے منطبق کر دے۔" ——— یوں محسوس ہوتا ہے کہ آرنلڈ نے یہ جملہ بالخصوص فراقؔ کے بارے میں کہا ہے اردو ادب کو فراقؔ نے جس قدر نئے اور جدید تصوّرات اور تخیلات دیئے ہیں۔ مستقبل کو جتنی نئی روایات بخشی ہیں' نئے الفاظ ڈھالے ہیں۔ لچک دار بحروں کو استعمال کیا ہے' لطافت' نرمی اور حُسن اور لوچ کا اضافہ کیا ہے اردو کے کسی اور

شاعر کو میسّر نہیں آیا۔ انہوں نے خالص حُسن و عشق کے تصوّرات میں زندگی کے ٹھوس حقائق سمو کر رکھ دیئے ہیں اُن کے الفاظ میں اتنی لچک اور رس ہے کہ میرؔ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں رمزیت اور اشاریت کے وہ پہلو ملتے ہیں جو تمام اردو شاعری میں خال خال نظر آتے ہیں۔ اُن کی سادگی کا جواب نہیں جذباتیت اور فلسفے کے سلسلے میں غالبؔ کے سوا کوئی بروئے کار نہیں آتا —— میں نے جو کچھ کہا ہے وثوق سے کہا ہے۔ اور اس میں حقیقت کے علاوہ کسی قسم کی آمیزش نہیں —— حُسن و عشق ان کے خاص موضوع ہیں —— اس سلسلے میں جو کچھ اُن کے قلم سے نکلا ہے وہ یقیناً اردو غزل کے باب میں ایک نیا اضافہ ہے۔ ایک شعر سنئے اور سر دھنئے۔

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

اُن کی شاعری ایک انقلاب ہے —— قدیم روایات کے خلاف —— اور یہ انقلاب ایک ایسے مستقبل کی اساس ہے جو فراقؔ کا نام غالبؔ سے پہلے نہیں تو اُس کے ساتھ ضرور لے گا ——

اور کیا عرض کروں —— کچھ نہیں —— دیکھئے۔ فراقؔ کی شاعری آپ کو اشارے کر رہی ہے —— ہیں درمیان میں آنے والا کون؟ ——

لاہور ۲۷ر اپریل ۱۹۴۵ء

یوسف ظفر

عرضِ مصنّف

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے مکتبۂ اردو کی طرف سے جناب چودھری برکت علی صاحب لاہور سے گھومتے پھرتے الٰہ آباد تشریف لائے اور تعرفِ غائبانہ کی بنا پر مجھے بھی نوازا۔ اور میری غزلوں کا ایک مجموعہ مکتبۂ اردو سے شائع کرنے کی بات چیت مجھ سے کر گئے۔ کچھ دنوں بعد میں نے اندازاً پندرہ سو اشعار کا مسودہ ان کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ پھر کچھ زمانے تک ہم اور وہ دونوں غافل ہو گئے۔ اس عرصے میں کبھی وہ مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ مقدمہ لکھ بھیجیے اور کبھی میں اُن سے تقاضا کرتا تھا کہ کتاب چھاپ کر بازار میں لائیے۔ آخر کار اُن کی نظرِ انتخاب جناب یوسف ظفر پر پڑی جنہوں نے اپنی پسند کے مطابق میرے بھیجے ہوئے اشعار سے وہ اشعار چُن لئے جو آج "شعلۂ ساز" کے نام سے آپ کے سامنے ہیں۔

میں نے جب اس مجموعے کیلئے نام ڈھونڈنا شروع کیا تو میرا خیال اس نغمگی اور ترنم اور ان غزلوں کی اُس لَے اور سنگیت کی طرف گیا جو میرے اور غالباً میرے ہم عصروں کے دلوں کی فضا میں گونج چکا تھا۔ اور غالباً اسی لئے غیبی طور پر شعلۂ ساز کا نام میری زبان پر آگیا۔ اس نام کا دور سے بھی کوئی تعلق حضرت جگرؔ مرادآبادی کے مجموعۂ کلام کے نام "شعلۂ طور" سے نہیں ہے۔ "شعلۂ طور" کے اثر اور تقلید کی پرچھائیں بھی اس نام پر نہیں پڑی۔ میں دیگر مشاہیر کی غزلوں پر نہ عموماً غزل کہتا ہوں نہ صورت بدل کر اُن کی کتابوں کے نام کو ہتیا لینے کی خواہش کرتا ہوں۔

میں مکتبۂ اردو لاہور کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جناب یوسف ظفر کی نوشتہ "عرضِ مرتب" میرے پاس بھیجدی یوسف ظفر صاحب کو "عرضِ مرتب" لکھنے میں اور مشکلات کے علاوہ یہ دِقّت بھی رہی ہے کہ میرا پورا کلام اُن کے سامنے نہیں تھا مجھ سے ان کی ذاتی آگاہی بھی بہت مختصر اور محدود رہی ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُن کے چند بیانات باوجود اُن کے نقادانہ خلوص اور نیک نیتی کے ایسے ہیں کہ اُن کی ترمیم و تنسیخ کر دی جاتے۔ مثلاً:۔

۱ میرے بچپن میں میرے گھر کی فضا محض شاعری کی فضا نہ تھی۔ شاعری کے علاوہ کچھ اور بھی معقول کام اور معقول باتیں ہوتی تھیں۔ اور یہ تو بالکل صحیح نہیں ہے کہ میں یا میرے گھر کا ایک فردِ واحد بھی ناسخؔ، اماننتؔ یا دیگر لکھنوی شاعروں یا اس اسکول کے دیگر شعرا جس قسم کے اشعار کہتے تھے ایسے اشعار سے متاثر تھے۔ ہمارا گھر بھر ایسے اشعار کی دل کھول کر ہنسی اڑاتا تھا البتہ میرے گھر میں ایک آدھ لوگ ایسے ضرور تھے جو امیر مینائی کے معتقد تھے۔ امیر مینائی کی شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں تصنع کے باوجود ایک خلوص ہے۔ رس ہے۔ رنگینی ہے اور لچک سا ہے۔ اسی لئے ابتدا میں میں بھی مینائے امیر کی

ان جلوہ سامانیوں، ولکرشمہ سازیوں کی طرف کھینچا۔ خاص کر اُنکے کلام کے ایک حصّے کے رچاؤ اور سجاوٹ نے اور ترنم نے مجھے متوجہ کر لیا اور اُن کی مضمون آفرینی و نازک خیالی نے۔ لیکن سب سے گہرا اثر جو بچپن میں میرے وجدان پر پڑا وہ سنگیت اور موسیقی کی گہری تہوں کا اثر تھا اور سورداس تلسی داس اور دیگر ہندی شعراء اور پھر غالب و حافظ اور اس کے بعد کچھ انگریزی نظموں کی نغمگی کا اثر تھا۔ اس کے بعد مجھ میں یہ صلاحیت آنے لگی کہ دلّی اسکول کے شعراء اور جدید لکھنوی یا دیگر شعراء مثلاً عزیز، صفی، محشر، ثاقب، شاد عظیم آبادی اور آسی غازی پوری کی نغمہ سرائیوں سے تسکیف اور متاثر ہو سکوں۔

عـ۲ رامپور دربار سے شائع شدہ مجموعہ "اوراقِ گل" میں جہاں میرا ذکر آیا ہے وہ بھی کچھ گمراہ کن ہے۔ رامپور میں میں نے اپنے متعلق جو بیان دیا تھا معلوم ہوتا ہے اس کے کچھ حصّے "اوراقِ گل" میں شامل ہونے سے رہ گئے اور کچھ بدلی ہوئی شکل میں شائع ہو گئے مثلاً حضرت امیر مینائی سے میں کس طرح متاثر ہوا ہوں اُسکا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ کلام امیر کی بہت ہلکی پرچھائیں میرے ابتدائی کلام پر ضرور پڑ رہی ہے لیکن امیر اسکول کا شاعر میں نہیں ہوں۔ اور یوسف ظفر صاحب نے بھی اس امر کا اندازہ کرتے ہوئے یہ بجا طور پر لکھا ہے کہ میں نے اپنی شاعری کی کائنات الگ تعمیر کی ہے۔" اوراقِ گل" میں یہ بات بھی آ گئی ہے کہ میں اردو میں آزاد نظم یا بے قافیہ نظم کو غیر مستحسن سمجھتا ہوں شاید میں نے ایسا وہاں کہہ دیا ہوگا۔ سفر رامپور کے بعد میں نے "آدھی رات" کو کے عنوان سے خود ایک غیر مقفیٰ نظم کہی۔ کم از کم اب میرا یہ خیال ہے کہ شعریت اور سلیقہ سے کہی ہوئی غیر مقفیٰ یا آزاد نظم بھی اردو میں ایک اہم چیز ہو سکتی ہے۔ یوں تو روحِ شاعری کے متعلق میرے مرکزی و بنیادی تاثرات وہی ہیں جو دنیا کے بلند شاعرانہ کلچر کے تصورات رہے ہیں لیکن ان تصورات میں تنوع اور اگاؤ کے بیشمار امکانات ہیں میں ایسی غیر مقفیٰ نظم یا آزاد نظم کا امکان سمجھتا ہوں۔ جس میں شاعری کی دیوی اپنی چھتیسوں سنگار کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

عـ۳ میں اور فانی بدایونی ——— نہ جانے کچھ حضرات نے یہ کیسے طے کر لیا کہ میں فانی بدایونی کا تتبع یا تقلید کرتا ہوں۔ یا یہ کہ میرے وجدان پر فانی کے وجدان کا یا میرے کلام پر کلامِ فانی کا ہلکا یا گہرا اثر ہے۔ کچھ اسی قسم کا اشارہ ایک بار حضرت عندلیب شادانی نے کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی کسی جگہ اسی طرح کا خیال ظاہر کیا اور غالباً انہی حضرات کی اس خوش اندیشی کے زیرِ اثر جناب یوسف ظفر نے بھی کچھ اس طرح کی بات کہہ ڈالی ہے اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو اس کا نیم شعوری احساس ہے کہ جو ماہیت جو انداز اور عنوان فانی بدایونی کے دہاں ہے اس سے میرے یہاں غم و الم کی حقیقت بہت بدلی ہوئی ہے میں کلامِ فانی کے محاسن کا قائل ہوں بحیثیت قاری یا سامع کے میں اُنکے نغموں سے کافی متاثر ہوں لیکن بحیثیت فراق گورکھپوری کے میرا شاعرانہ وجدان اور میرا احساسِ حیات و کائنات فانی سے اتنا مختلف ہے جتنا شاید فانی اور اُردو کے کسی دوسرے شاعر کا وجدان و احساس مختلف نہ ہوگا۔ فانی کے یہاں فنّی محاسن کے ساتھ پُرخلوص گریہ و زاری ہے شکوۂ محبوب شکوۂ روزگار ہے اور میرے یہاں حیات و کائنات کی ہم آہنگی اُنکی رمزیت اور طہارت اور اُن کی لامحدود معنویت کا احساس ہے۔ فانی کے یہاں جتنا ہی شدید کرب و الم ہے میرے یہاں اتنا ہی شدید سوز

دگداز ہے۔ اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ میں شاعری میں باوجود اضطراب اور ہیجان سکون اور شفا کا قائل ہوں۔ اور فانی غالباً کرب و اضطراب ہی کے قائل ہیں لیکن جس رچے ہوئے خلوص کا ثبوت فانی نے اپنے کلام میں دیا ہے اُسے میں نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں جناب یوسف ظفر نے میرے جس بیان کی نقل کی ہے اُسے بجائے روا روی میں پڑھنے کے میری استدعا ہے کہ آپ ذرا غور و تامّل سے پڑھیں۔

۴ء فانی کا ذکر کرتے ہوئے جناب یوسف ظفر ایک اور بھی ایسی بات کہہ گئے ہیں جو حقیقت سے بہت دور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب فانی کی یہ غزل ؎

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

شائع ہوئی اس وقت امیر و داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ فانی کی یہ غزل ۱۹۲۱ء یا ۲۲ء میں غالباً علیگڑھ میگزین میں شائع ہوئی۔ اس وقت تک اردو کے زندہ اور حساس طبقے میں امیر اور داغ کا اثر بالکل ہٹ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آسی غازیپوری۔ حالی پانی پتی۔ شاد عظیم آبادی اور خود میرو غالب کے کلام کی نشاۃ ثانیہ ہو چکی تھی۔ عزیز و صفی وغیرہ کی رہنمائی میں لکھنؤ کے جذباتی مدرسے نے تغزل اور ترنم کا نیا انداز شروع کر دیا تھا۔ حسرت۔ اصغر۔ جگر کی نغمہ سرائیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ فانی پر بھی نظریں پڑ رہی تھیں۔ اور یگانہ آرٹ بھی اپنے پینترے دکھا رہا تھا۔ میری شاعری کی عمر البتہ اس زمانے میں لے دے کے چار پانچ سال سے بھی کم تھی۔ اور بہیئت سست روی سے میری غزلگوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن اول تو لکھنؤ اسکول کا مجھ پر بچپن سے ہی کوئی خاص اثر نہ تھا۔ دوم یہ کہ میں امیر مینائی کے پیدا کیے ہوئے اثرات کی منزلوں کو بھی اب خیر باد کہہ رہا تھا۔ جن شاعروں کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ اُن کا مجموعی اثر اور اپنے مطالعۂ ادب کے اثرات لے کر میں اپنی غزلگوئی کی راہ تلاش کر رہا تھا اور اپنی آواز ڈھونڈ رہا تھا۔ میری شاعری کا بہت خفیف حصہ ظاہری طور پر تقلیدی ہے اور باطنی یا معنوی لحاظ سے تو شاید میں نے تقلیدی شعر کہے ہی نہیں۔ مجھے لکھنؤ اسکول کا چسکا کبھی نہیں پڑا۔ شروع ہی سے میں دلّی اسکول کی صداقت اور خلوص کا قائل رہا ہوں۔ لیکن اہلِ دلّی کی تقلید اور تتبّع بھی یا اپنے ہم عصروں کی تقلید اور تتبع بھی میں نے شاید ہی کیا ہو۔ رہا جناب یوسف ظفر کا یہ قول کہ میں نے بیس برس تک اردو شاعری کو کوئی نئی چیز نہ دی تو میری گذارش یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ شروع میں آٹھ دس برس تک ضرور میری آواز اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی مجھے اور کچھ دوسرے اصحاب کو بھی اس کا پتہ چل چکا تھا کہ میں اچھے یا بُرے کسی معنے میں محض تقلیدی شاعر نہیں ہوں۔ میری شاعری کی عمر جیسا جناب یوسف ظفر نے فرمایا ہے ربع صدی ہے۔ اس میں شروع کے دس برسوں کے اندر میں نے مشکل سے سات آٹھ سو اشعار کہے تھے۔ بیچ کے آٹھ نو برس میں میں نے ڈھائی ہزار کے قریب اشعار کہے اور گذشتہ چھ سات برس کے اندر میں نے کم و بیش چار ہزار اشعار کہے۔

جو کچھ کہا ہے وہ شروع کے پندرہ برس کے کلام کا چوگنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر میں نے کچھ قابلِ قدر نئی چیزیں اردو کو دی ہیں تو اُن کا بہت بڑا حصّہ بلکہ نوّے فیصدی حصّہ گذشتہ آٹھ نو برسوں کے اندر ہی دیا ہے لیکن اس کا سبب میری ابتدائی شاعری کی فطری سست رفتاری تھی نہ کہ ماضی کی لکھنوی شاعری کا بوجھ۔ اگر آپ "شعلۂ ساز" کے اشعار کو قدرے غور سے گنگنائیں گے تو شاید آپ کو بھی اِس کا احساس ہو جائے گا۔ کہ اس قسم کی شاعری جلد پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا کرتی۔ اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ گذشتہ دس برس کی میری شاعری کا ایک قلیل حصّہ ہی "شعلۂ ساز" میں شامل ہو سکا ہے۔

یوسف ظفر صاحب نے جو کچھ "عرضِ مرتب" میں کہا ہے وہ خلوص سے بھرا ہے۔ میرے نزدیک اُن کے وہ بیانات جنکی ترمیم و اصلاح کرنا میں نے ان سطور میں ضروری سمجھا اُن دِقتوں سے تھے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں یعنی میرے پورے کلام یا میرے کلام کے بڑے حصّے کا اُن کے سامنے نہ ہونا اور مجھ سے اُن کی ذاتی واقفیت کا بہت محدود و مختصر ہونا۔

شعلۂ ساز میں اشعار کا انتخاب کیسا ہوا ہے اس کے بارے میں مَیں کچھ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انتخاب میں نے نہیں دیکھا۔ اگر میں خود انتخاب کرتا تو ممکن ہے کہ میں کئی وہ شعر کاٹ دیتا جو جناب یوسف ظفر نے رکھ لئے ہیں اور کئی وہ اشعار شامل کر لیتا جنہیں انہوں نے داخل کر لیا ہے اگر ایسا ہے تو "شعلۂ ساز" کے دوسرے اڈیشن میں یہ تنسیخ اور اضافے ہو جائیں گے۔ اور اُس وقت تک بلکہ اُس سے پہلے ہی میرے وہ دوسرے مجموعے بھی آپ کے سامنے آ چکیں گے جو اس وقت زیرِ طبع ہیں۔

"مکتبہ اردو" اور جناب یوسف ظفر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فی الحال آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ یا آپ کے سامنے آ رہا ہوں ؛

الہ آباد ــــ
۶ مئی سنہ ۱۹۴۵ء

فراقؔ گورکھپوری

نصیبِ خفتہ کے شانے جھنجھوڑ سکتا ہوں
طلسمِ غفلتِ انساں کو توڑ سکتا ہوں

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل
مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں

اُبل پڑیں ابھی آبِ حیات کے چشمے
شرار و سنگ کو ایسے نچوڑ سکتا ہوں

بہار جل کے خزاں ہو خزاں لہک کے بہار
چمن میں ایسے شگوفے بھی چھوڑ سکتا ہوں

نگاہِ غیب بھی جن تک ابھی پہنچ نہ سکی
اِن انگلیوں سے وہ تارے بھی توڑ سکتا ہوں

نہ ہاں میں وہ لچک اور نہ ہے نہیں میں کشش
کہ خیر و شر کے سروں کو بھی جوڑ سکتا ہوں

ہے زیر و بم مری لے کا حریفِ ضربِ کلیم
بلند و سخت چٹانوں کو پھوڑ سکتا ہوں

مرے ہی سینے میں ہر صبح تھرتھراتی ہے
شبِ سیاہ کی زنجیر توڑ سکتا ہوں

فراقؔ دیکھ بدلتی ہے منزلِ آفاق
کہ مہر و ماہ کی میں باگ موڑ سکتا ہوں

یہ کون مسکراہٹوں کا کارواں لئے ہوئے
شباب وشعرورنگ بو کا دھواں لئے ہوئے

دھواں کہ برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
چٹیلی زندگی کی شادمانیاں لئے ہوئے

لبوں سے پنکھڑی گلاب کی حیات مانگتی ہے
کنول سے آنکھ میں نگاہِ مہرباں لئے ہوئے

قدم قدم پہ دے اُٹھی ہے لَو زمینِ رہگذر
ادا ادا میں بے شمار بجلیاں لئے ہوئے

نکلتے بیٹھتے دلوں کی آہٹیں نگاہ میں
رسیلے ہونٹ فصلِ گل کی داستاں لئے ہوئے

خطوطِ رُخ میں جلوہ گہ وفا کے نقش سربسر
دلِ غنی میں سب حسابِ دوستاں لئے ہوئے

وہ مسکراتی آنکھیں جن میں رقص کرتی ہے بہار
شفق کی گل کی بجلیوں کی شوخیاں لئے ہوئے

ادائے حسن برق پاش شعلہ زن نظارہ سوز
فضائے حسن اودی اودی بدلیاں لئے ہوئے

جگانے والے نغمہ سحر لبوں پہ موج زن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

وہ نرگسِ سیاہ نیم باز میکدہ بدوش
اندھیری مست راتوں کی جوانیاں لئے ہوئے

تغافل وخمار اور بیخودی کی اوٹ میں
نگاہیں اک جہاں کی ہوشیاریاں لئے ہوئے

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے

Her Eloquent Blood Spoke And it Seemed
That Her Body Thaught

Gohn Denni

ز فرق تا بہ قدم تمام چہرہ جسمِ نازنیں
لطیف جگمگاہٹوں کا کارواں لئے ہوئے

۱؎ تبسّمِش تکلّمے "تکلّمِش تبسّمے"
نفس نفس میں تھرتھراتا سازِ جاں لئے ہوئے

نگاہِ نازِ بزم و صاف داستانِ دوستی
جبینِ ناز لاکھوں دلنوازیاں لئے ہوئے

وہی جبینِ نور جس پہ پڑ رہی ہے چھوٹ سی
خود اپنی جگمگاہٹوں کی کہکشاں لئے ہوئے

"ستارہ بار و مہ چکان و خور فشاں" جمالِ یار
جہانِ نور کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

وہ زلف خم بہ خم شمیمِ مست سے دھواں دھواں
وہ رُخ چمن چمن بہارِ جاوداں لئے ہوئے

یہ مستیٔ جمال کائنات خوابِ کائنات
یہ گردشِ نگاہ دورِ آسماں لئے ہوئے

یہ کون نو بہارِ ناز آیا عضو عضو میں
جوانیاں جوانیوں کی آندھیاں لئے ہوئے

یہ کسکی مہکی مہکی سانسیں تازہ کر گئیں دماغ
شبوں کے راز، شبنموں کی نرمیاں لئے ہوئے

یہ کن نگاہوں نے مرے گلے میں باہیں ڈال دیں
جہان بھر کے دُکھ سے درد امان لئے ہوئے

نگاہِ یار دے گئی مجھے سکونِ بے کراں
وہ بے کہی وفاؤں کی گواہیاں لئے ہوئے

سُتے سے چہرے پر حیاتِ رسمسائی مسکرائی
نہ جانے کب کے آنسوؤں کی داستاں لئے ہوئے

مری نگاہ تھرتھرا رہی ہے روئے یار پر
یقیں سے بھی استوار کچھ گماں لئے ہوئے

۱؎ یعنی وہ وہ باتیں جن کا الفاظ کے ذریعے کوئی عہد و پیماں نہیں ۔ ہے خسرو کا یہ مصرع :۔ بوسہ گفت و زباں گزانید جس میں بوسہ گفت کے معنی بوسہ دینے کو کہا یا بوسہ دینے کا وعدہ کیا۔

مرا وہ رس کا تپلا آنکھوں کا وہ تارا آ گیا
نظر نظر میں التفاتِ شادماں لئے ہوئے[1]

ترے نہ آنے تک اگرچہ مہرباں تھا اک جہاں
میں رو کے رہ گیا ہوں سو غمِ نہاں لئے ہوئے

تو آ گیا تو آ گیا یہ شام جگمگا اٹھی
بہار لہلہا اٹھی شمیمِ جاں لئے ہوئے

فضائے اشتیاق ہے کہ رنگ و بو کی گردنیں
ترے جمالِ لالہ گوں کی داستاں لئے ہوئے

فراقؔ آج پچھلی رات کیوں نہ مر رہوں گا اب
حیات ایسی شامیں ہوگی پھر کہاں لئے ہوئے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گذری، وہ رات رات ہوئی

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

---

[1] لبِ جاناں ہیں پھر حرفِ تبسم ÷ پناہ اس التفاتِ شادماں سے — حسرتؔ

سینے میں جوانی کے ابھرتے ہوئے طوفاں — کیا لغزشِ مستانہ ہے اے سروِ خراماں
لہرائی ہوئی توسِ قزح قامتِ رنگیں — اُٹھتے ہیں قدم یا لہک اُٹھتا ہے گلستاں
پو پھوٹ رہی ہے زجبیں تا بہ کفِ پا — یا چادرِ شبنم میں جھلکتا ہے گلستاں
آنکھوں میں جوانی کی چمکتی ہوئی بجلی — سینے میں محبت کے مچلتے ہوئے ارماں
شوخی جو حیا کے بھی دبائے نہیں دبتی — لو دیتا ہے کیا کیا یہ چراغِ تہِ داماں
آگے ترے اے شوخ یہ عالم ہے کہ گلزار — اک رنگ پریدہ ہے کہ اک بوئے پریشاں
یہ مست ادائیں ہیں کہ کعبے پہ گھٹا چھائی — یہ موجِ تبسّم ہے کہ مندر میں چراغاں
تو تیرگیٔ شام بھی تو نورِ سحر بھی — مستی بھی ہے چھائی ہوئی چہرہ بھی درخشاں
تاروں کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے فسانے — لیتے ہیں ترے حُسن سے کیفیتِ پنہاں
ہر سانس کوئی مہکی ہوئی نرم سی لے ہے — لہراتا ہوا جسم ہے یا ساز ہے لرزاں
یا مدبھری پُروائی میں رس ڈول رہا ہے — یا مست اداؤں میں ہے اِک لہر سی رقصاں
چہرے سے عیاں صبحِ درخشاں کی بہاریں — گیسو میں نہاں تیرگیٔ شامِ غریباں

لرزش سی ہے راہوں میں زہے شوخیٔ رفتار — جنبش سی ہے نظروں میں کہ ہے گردشِ دوراں
اے دوست مہکتی ہیں ابھی تک وہ فضائیں — جن میں تھا کھِلا تیرے تبسّم کا گلستاں
باتوں میں ہیں جی اُٹھنے کے مُردوں کو اشارے — گھاتوں میں ہیں دُنیا کے مٹا دینے کے امکاں
عارض کی جھلک ہے کہ چھلک جاتے ہیں ساغر — ماتھے کی دمک ہے کہ طلوعِ مہِ تاباں
ابرو کی لچک ہے کہ لپک جاتی ہے شمشیر — گیسو کی لٹک ہے کہ گھٹائیں ہیں خراماں
رگ رگ میں کسک ہے کہ اِک آئی ہوئی انگڑائی — سینے کی جھلک ہے کہ لہکتا ہے گلستاں
چہرے کی مہک روکشِ خوشبوئے گلِ خلد — باتوں کی چہک جلوہ دہِ لعلِ بدخشاں
اِس نرم نگاہی سے چمک اُٹھتا ہے اے دوست — وُہ درد جو اِنساں کو بنا دیتا ہے اِنساں
اَے دوست یہ تو ہی ہے جسے دیکھ رہا ہوں — یا خواب ہے شاعر کا کوئی شعلہ بداماں

پڑتے ہی نظر تجھ پہ محبّت نے پکارا
نکلا مری قسمت کو جگاتا مہِ تاباں

بازیٔ عشق کی پوچھ نہ بات — جیت کی جیت ہے مات کی مات

وہ اور نہ ٹھہرے رات کی رات — سچ ہے، بن آئے کی بات

چھڑ گئی اُن آنکھوں کی بات — دنیا میں اب دن ہو کہ رات

کٹتے کٹتے کٹتی ہے — ہجر کی گھٹتی بڑھتی رات

عشق کی دنیا نیاری ہے — اس نگری میں دن ہے نہ رات

رکھ رکھاؤ اُس آنکھ کا دیکھ — چپ کی چپ اور بات کی بات

اپنا دیس بھی اب ہے بدیس — اپنی خبر بھی دور کی بات

پانی کا تو بہانہ ہے — آگ لگاتی ہے برسات

چال نہ چلنے تک ہے خیر — چال آتے ہی بازی مات

رمز و کنایہ کی ہے جان — اس کی سیدھی سادی بات

پگھلا سونا روشن دن — پگھلی چاندی چاندنی رات

قاتل اس کو کون کہے   ہنس مکھ آنکھیں کوئل گات

جینے والے جی ہی لیں گے   اب نہ ملو گے ؟ اچھی بات

ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر   کب یاد آئی کب کی بات

پونچھ یہ جلتے جلتے اشک   دیکھ یہ بھیگی بھیگی رات

اُڑی نیند سے پُوچھ فراق

آئی ہو گی کتنی رات

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آب حیات

ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے

طلوعِ صبح کی مانند تھرتھرائے جا

نگاہِ یار ترا یُوں تو ہے پیام کچھ اور

مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

دیکھ محبّت کا یہ عالم
ساز بھی کم کم، سوز بھی کم کم

یہ شیرازۂ دل کا ہے عالم
یک جا، یک جا، برہم برہم

حسنِ گلستاں شعلہ و شبنم
سوزاں سوزاں، پُرنم پُرنم

یاد ہے اُن آنکھوں کا وہ عالم
مستی کم کم، وحشت کم کم

ساکت ساکت شورشِ عالم
دل کی صدا بھی مدھم مدھم

عالم عالم عشق بھی تنہا
تنہا حُسن بھی عالم عالم

یہ کیا کم ہے عشق کا حاصل
کچھ مجھ کو غم، کچھ تجھ کو غم

غمکدۂ دل کا یہ دھندلکا
روشنی کم کم، تیرگی کم کم

سازِ محبت، نغمۂ جنّت
سوزِ محبّت، نارِ جہنّم

رنگ ہے کس کا، روپ ہے کس کا
نکھرا نکھرا، مبہم مبہم

دل کی وہ دنیا ہے جو ہوگی
برہم ہو کر اور منظّم

دل کی جراحت، تیری محبت
ایسا زخم نہ ایسا مرہم

آتی بہاریں جاتی بہاریں
دونوں کا حاصل دیدۂ پُرنم

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے
جھوٹے نہیں تم، جھوٹے نہیں ہم

ہم نے بھی آج فراقؔ کو دیکھا
سوزِ مکمل، دردِ مجسّم

ڈوبنے دے نہ بیچ میں بیڑا   لبِ ساحل اسے ڈبو لینا
کہیں گم گشتگانِ ہجر بھی ہیں   بوئے یار اس طرف بھی ہو لینا
موسموں کا فریب کھانا ہے   تو چمن سے بھی ہاتھ دھو لینا
سو بھی لینا جو موت ہاتھ آئے   زندگی ہے تو جان کھو لینا
نگہِ شوق جب وہ جلوے لٹائے   بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا
زندگی کو پلا کے آبِ حیات   زہر میں بھی اسے سمو لینا
آج آنکھوں میں کاٹ دے شبِ ہجر   زندگانی پڑی ہے سو لینا

ابھی سنبھلے رہو کہ دن ہے فراقؔ
رات بھر بیقرار ہو لینا

جب ہمیں سمجھے، ملایک اور شیاطیں رو گئے
ہم خدا تھے قسمتوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے

بڑھ گئیں پچھلے پہر کچھ اور بھی تنہائیاں
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے ستارے سو گئے

کوئے جاناں کے بھی اِک مدت سے ہیں آہٹ پہ کان
اہلِ غم کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے

مٹ نہ سکتے تھے بہ کوثر بھی جو داغِ گناہ
تیرے غم کے آنسوؤں سے ہم وہ دھبے دھو گئے

دیکھتا ہوں جاگتا خواب اِک نئی دنیا کا آج
اگلے وقتوں کے جو تھے ہنگامہ آرا سو گئے

خواب آغازِ محبت کے نہ پھر آئے نظر
خود نگاہِ ناز کے کتنے پیام اُن کو گئے

اُٹھ ہی جاتے ہیں فراق اِک دن حجاباتِ حیات
آج طولِ زندگانی کو خضر بھی رو گئے

اِس سکوتِ فضا میں کھو جائیں
آسمانوں کے راز ہو جائیں

حال سب کا جُدا جُدا ہی سہی
کس پہ ہنس جائیں کس پہ رو جائیں

راہ میں آنے والی نسلوں کے
خیر کانٹے تو ہم نہ بو جائیں

کچھ تو رُسوائیوں کا نام اُچھلے
عشق میں آبرو ڈبو جائیں

آؤ اس تنگنائے دنیا کی
وسعتِ بیکراں میں کھو جائیں

زندگی کیا ہے؟ آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

رات آئی فراقؔ! دوست نہیں
کس سے کہیے کہ آؤ سو جائیں"

رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

لے اُڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پہ بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب
عشق کا رونا ہے کچھ تقدیر کا رونا نہیں

دل بھی کہتا ہے ٹھہرنا ہجر میں دشوار ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچّھا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثارِ محبت جان دے دینا نہیں

حُسن سر تا پا تمنّا، عشق سر تا سر غُرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

سرحدِ جذب و اثر سے حُسنِ جاناں دُور ہے
عشق کی دنیا بھی شاید عشق کی دنیا نہیں

غور کر اس کیفیت پر کچھ سمجھ یہ سوز و ساز
عشق میں دل درد ہو جاتا ہے دل دُکھتا نہیں

ہوش ہو جوشِ جنوں ہو، غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اُس بزم میں چھلکا نہیں

یوں بھی آتی ہے قیامت اے خرامِ نازِ یار
ہٹ کے بھی دنیا محبت کی تہ و بالا نہیں

ایک حالت پر زمانے میں نہ گذری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دُنیا نہیں

جس کے شعلوں سے تھی کل تک گرمیِ بزمِ حیات
آج اِس خاکسترِ دل سے دھواں اُٹھتا نہیں

عشق کی بھی زندگی میں انقلاب آ ہی گیا
آج اس کو دیکھ کر دل کا سکوں دیکھا نہیں

مَیں عدم اندر عدم مَیں ہوں جہاں اندر جہاں
ایک ہی دُنیا ہو میری اے فراؔق ایسا نہیں

امید و یاس کے اب وہ پیام بھی تو نہیں — حیاتِ عشق کی وہ صبح و شام بھی تو نہیں

بس اِک فریبِ نظر تھا جمالِ گیسو و رُخ — وہ صبح بھی تو نہیں اب وہ شام بھی تو نہیں

مصالحت کی اُمید ایسے بے نیاز سے کیا — ادائے بے رُخیِ حُسنِ عام بھی تو نہیں

علاج بھی غمِ پنہاں کا ہو تو کیونکر ہو — جو لے سکے کوئی وہ تیرا نام بھی تو نہیں

بتا سکیں گے یہ کیا فرقِ قید و آزادی — کہ تیرے صیدِ بلا زیرِ دام بھی تو نہیں

کبھی اُنہیں بھی زمانے میں تھی خوشی کی تلاش — اب اہلِ غم کو یہ سودائے خام بھی تو نہیں

بس اِک تسلسلِ تغیرِ حال قائم ہے — نصیبِ عشق فنا و دوام بھی تو نہیں

فراقؔ جلوۂ ساقی کے سب کرشمے تھے
کہ اب وہ رنگِ مئے لالہ فام بھی تو نہیں

تری نگاہ کے اب وہ پیام بھی تو نہیں
ادائے بے رخیٔ حسنِ عام بھی تو نہیں

انہیں محال ہے تمیزِ قید و آزادی
ترے اسیرِ بلا زیرِ دام بھی تو نہیں

دلِ حزیں میں ترے شوقِ مضطرب کے نثار
اُس انجمن میں ترا کوئی کام بھی تو نہیں

بیاں ہو کیسے وہ دیرینہ اختلاطِ نہاں
کہ تجھ سے آج پیام و سلام بھی تو نہیں

وہ کیا کہیں کہ کبھی، اہلِ شوق سے کھُل کر
ہوئی نگاہ تری ہم کلام بھی تو نہیں

ابد کی شام سے کچھ بڑھ گیا فسانۂ عشق
تمام بھی تو نہیں، نا تمام بھی تو نہیں

نہ ہوش ہی کا یہاں ٹھیک کچھ نہ غفلت کا
دیارِ دل میں کوئی انتظام بھی تو نہیں

کہاں کی دوزخ و جنت کہاں کے رنج و خوشی
کسی کے ہجر میں جینا حرام بھی تو نہیں

سکوں شناس نہیں بوالہوس، کہ یہ تیرے
شہیدِ جلوۂ طرزِ خرام بھی تو نہیں

کبھی انہیں بھی زمانے میں تھی خوشی کی تلاش
اب اہلِ غم کو وہ سودائے خام بھی تو نہیں

فراقؔ غم کو میسر نہیں دوام یہاں
سحر نہ ہو سکے جس کی وہ شام بھی تو نہیں

وہ سوز و سازِ دلِ نامراد بھی تو نہیں
کہ ماجرائے غمِ دوست یاد بھی تو نہیں

سکوتِ عشق بہ عنوانِ شکوہ بھی نہ رہا
کہ اپنے آپ پر اب اعتماد بھی تو نہیں

فسانے عشق کے ہیں ماورائے کیف و اثر
اُداس بھی تو نہیں اب میں شاد بھی تو نہیں

فسانۂ نگہِ اوّلیں سنائے کون
وہ رُوئداد کوئی رُوئداد بھی تو نہیں

نثارِ پرسشِ حالِ خراب، کیا کہیئے
کہ ایسے میں کوئی افسانہ یاد بھی تو نہیں

نظامِ دہر ترا حال کیوں دگرگوں ہے
ابھی مزاجِ جنوں میں فساد بھی تو نہیں

فراقؔ ہوئے دوئی درمیاں ہے کیا کہیئے
جنوں کو حسن پہ اب اعتماد بھی تو نہیں

داستاں درد داستاں افسانہ در افسانہ تھا
اِک خیالِ دوست شامِ بےکسی کیا کیا نہ تھا

داستانِ حُسن سے آراستہ تھی بزمِ دہر
عشق کا نام آتے ہی سارا جہاں افسانہ تھا

تھی غرورِ حسن میں بھی اک ادائے انکسار
عجز میں بھی عشق کا انداز گستاخانہ تھا

اُف وہ اندازِ جنوں، سازِ جنوں، رازِ جنوں
تھرتھراتی تھی فضا جھجکا ہوا دیوانہ تھا

میں گریباں چاک تو پردہ نشیں سچ ہے مگر
کب کھُلا رازِ محبت حُسن کب رسوا نہ تھا

قید بھی آزاد بھی آباد بھی برباد بھی
کیا بتائیں کیا خدا رکھے۔ دلِ دیوانہ تھا

غیر بھی اپنا تھا اے دل جلوہ گاہِ حُسن میں
آشنا وحشت سرائے عشق میں بیگانہ تھا

کیا دیا تھا عشق نے اسکو نہ پوچھ اے ہمنشیں
خیر اب کیا ہے مگر وہ دن بھی تھے جب کیا نہ تھا

داستاں در داستاں تھی اک نگاہِ شرمگیں
اِک پیامِ زیرِ لب افسانہ در افسانہ تھا

ڈبڈبا آئے تھے آنسو الوداعِ دوست پر
دِل تہی ہو کر بھی اِک چھلکا ہوا پیمانہ تھا

مجھ کو اُس کی شوخیِ پنہاں نے مارا ہے فراقؔ
جس کا ہر انداز پردے میں بھی بیباکانہ تھا

یہ اور بات ہے وہ نہ ہوں شادماں کبھی
ہوتا ہے بیدلوں سے کوئی بدگماں کبھی

گو عشق کو ملا نہ کوئی ہم زباں کبھی
ہوتی تھی اور نہ ختم ہوئی داستاں کبھی

تھے محوِ نالۂ جرسِ کارواں کبھی
بڑھ بھی گئی ہے حسرتِ پس ماندگاں کبھی

وہ نغمہ چھیڑ مطربِ آتش بجاں کبھی
کوندی تھیں جس سے طور پہ کچھ بجلیاں کبھی

بستی کبھی، اُجاڑ کبھی، لامکاں کبھی
ٹھہری نہ ایک جا مری عمرِ رواں کبھی

ایّامِ خوش گوارِ محبت بھی کاٹ لے
مشکل بھی ہو رہیں گی یہ آسانیاں کبھی

یہ تا بکے حجابِ تغافل، ستم بھی کر
اپنا بھی کر خدا کے لئے امتحاں کبھی

نقشِ قدم ہیں اب نہ کہیں گردِ کارواں
منزل کو ہو سکا ہے غمِ رفتگاں کبھی

اب عشقِ بے خبر کو کسی کی خبر نہیں
دل تھا حریفِ گردشِ ہفت آسماں کبھی

کیا کیجئے جو کارِ محبت محال ہو
اب تک تو کوششیں نہ ہوئیں رائگاں کبھی

مانوس ہو چکا نگہِ آشنا سے بھی
کم ہو سکیں نہ عشق کی حیرانیاں کبھی

غم کی جھلک ہو یا وہ فریبِ نشاط ہو
تھا حسن و عشق کے بھی کوئی درمیاں کبھی

اِن کے سکوتِ یاس کو اب مدتیں ہوئیں
رکھتے تھے اہلِ درد بھی منہ میں زباں کبھی

سب کچھ بھی کھو کے حسن کو پانا محال ہے
سستی ہوئی نہ ہوگی یہ جنسِ گراں کبھی

منصور پرتوِ غمزۂ بے سود عشق ہے
لائے گی رنگ یہ خلشِ رائگاں کبھی

بزمِ بساطِ خلوتِ دل کر گیا کوئی
تھیں رشکِ انجمن یہی تنہائیاں کبھی

وہ ماجرائے عشق بھی خوابِ خیال ہے
تیری نگاہ سے جو ہُوا تھا بیاں کبھی

کوئی ترے فریبِ تبسم سے بچ سکا
تھا عشق بھی ملول کبھی شادماں کبھی

سازِ سکوت سازِ نوا ہائے راز تھے
تھیں حسن و عشق میں یہ ہم آہنگیاں کبھی

سر بھی اُنھیں ملا در و دیوار بھی مگر
کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

خاموشیاں جہان کی کچھ اور بڑھ گئیں
آئی صدائے درد اگر ناگہاں کبھی

منزل فریبِ کاوشِ پنہاں کا نام ہے
اپنی جگہ سے بڑھ نہ سکے کارواں کبھی

آوازِ صور دیکھ ابد کا سکوت دیکھ
ٹوٹا نہ اہلِ عشق کا خوابِ گراں کبھی

پرچھائیاں ہیں دار و رسن کی بھی عشق پہ
مٹ کر بھی مٹ سکا ہے کسی کا نشاں کبھی

بیگانگیِ حسن بھی اک رنگ پر نہیں
ناواقفِ ملال کبھی، راز داں کبھی

بادِ صبا نے دل کا کنول بھی بجھا دیا
کچھ اور بات تھی کہ کھِلے گلستاں کبھی

کیا کہہ دیا فراقؔ کہ وہ آگ ہو گئے
کر بیٹھتے ہیں آپ بھی شیطانیاں کبھی

ابھی آغازِ محبت کا ہے شادماں ہولے
پھر تو اتنا ہی بہت ہے کہ پشیماں ہولے
کچھ دنوں جوشش جنوں چاک گریباں ہولے
عقدۂ عشق ابھی اور کچھ آساں ہولے
آ۔ کہ انجامِ محبت کی خبر ہے مجھ کو
کچھ ترا درد بھی شرمندۂ درماں ہولے
صبر بھی یونہی جو آجائے تو کچھ دور نہیں
دل کا شیرازہ ابھی اور پریشاں ہولے
اُٹھ رہی ہے نگہِ محرم بیگانہ نما
جس قدر اب تجھے منظور ہو پنہاں ہولے
یہ حجابات بھی اُٹھ جائیں گے اے ذوقِ نظر
ابھی کچھ اور عیاں جلوۂ جاناں ہولے
تازہ کاریٔ محبت سے بھی واقف ہوں فراقؔ
اور ابھی وجہِ سکوں کچھ غمِ پنہاں ہولے

ستاروں سے اُلجھتا جا رہا ہوں
شبِ فرقت بہت گھبرا رہا ہوں

کسی کے غم کو بھی بہلا رہا ہوں
جہاں کو بھی سمجھتا جا رہا ہوں

یقیں یہ ہے حقیقت کھُل رہی ہے
گماں یہ ہے کہ دھوکے کھا رہا ہوں

جو اُلجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں
وہ گتھی آج تک سُلجھا رہا ہوں

اگر ممکن ہو لے لے اپنی آہٹ
خبر دو حُسن کو مَیں آ رہا ہوں

اجل بھی جھُوم جھُوم اُٹھتی ہے سُنکر
وہ نغمے زندگی کے گا رہا ہوں

زمیں پر ہیں قدم اور انگلیوں سے
ستاروں کو بھی چھیڑے جا رہا ہوں

غمِ جاناں ہوں، سر تا پا اُداسی
شبِ ہجراں ہوں کٹتا جا رہا ہوں

یہ عالم ہے تری بیدردیوں سے
نگاہِ لطف سے شرما رہا ہوں

اب آگے کیا ہو تسلیم و رضا کا
ابھی تک تو نباہے جا رہا ہوں

یہ سنّاٹا ہے میرے پاؤں کی چاپ
فراقؔ اپنی کچھ آہٹ پا رہا ہوں

جو درد کے مٹنے پر ہاتھ آئے وہ درماں ہوں

اعجازِ مسیحا کی تاخیرِ پشیماں ہوں
میں سازِ حقیقت کا اِک نغمۂ لرزاں ہوں
گلزارِ محبّت کی اک بوئے پریشاں ہوں
وہ عقدۂ ہستی ہوں، جو کھل نہ سکا اب تک
ظاہر ہوں نہ پنہاں ہوں مشکل ہوں نہ آساں ہوں
مَیں صبحِ ازل بھی ہوں مَیں شامِ ابد بھی ہوں
میں وصل کی عشرت ہوں طولِ غمِ ہجراں ہوں
تقریبِ سکوں یابی، اک پیکرِ بیتابی
موجِ مئے اُلفت ہوں، برقِ دلِ سوزاں ہوں
اِک کیفِ سکوں ساماں، اِک کشمکشِ پنہاں
لرزاں ہے جو نغمہ سے وہ سازِ رگِ جاں ہوں

معمورہ کا معمورہ۔ ویرانہ کا ویرانہ

میں جیبِ گلستاں ہوں، دامانِ بیاباں ہوں

ہیں دید کی حسرت بھی ہیں کیفِ تماشا بھی

کس شان سے پنہاں ہوں کس رُخ سے نمایاں ہوں

ہر رنگِ پریدہ ہے اک نکہتِ مستانہ

ہوش اور جنوں جس میں گم ہیں وہ گلستاں ہوں

اِک کوندتی بجلی ہوں، اس خرمنِ ہستی پہ

اس گلشنِ امکاں پہ اک شعلۂ رقصاں ہوں

ہلتی ہیں مرے بل پہ افلاک کی زنجیریں

مہر و مہ و انجم کا میں سلسلہ جنباں ہوں

افلاک پہ آوارہ آفاق کا گہوارہ

میں قافلۂ انجم میں گردشِ دوراں ہوں

تکمیل کے ہاتھوں بھی میں ہو نہ سکا پورا

کس شوخ کا پیماں ہوں کس دل کا میں ارماں ہوں

با ایں ہمہ سرشاری با ایں ہمہ ہشیاری

آپے سے میں باہر ہوں عالم سے میں پنہاں ہوں
بھولا ہوا افسانہ ٹوٹا ہوا پیمانہ

میں ہی غمِ جنت ہوں میں ہی دلِ انساں ہوں
پُرکار بھی سادہ بھی معصوم بھی قاتل بھی

ہے رُوحِ تغافل جو وہ شوخیٔ پنہاں ہوں
ہوں محض سکوں لیکن جانِ حرکت بھی ہوں

مَیں مرکزِ عالم ہوں میں عمرِ گریزاں ہوں
منہ موڑ کے ہستی سے ٹھکرا کے عدم کو بھی

کیا جانیے اب کس سے میں دست و گریباں ہوں
وہ درد ہوں کم ہو کر جو اور بھی بڑھ جائے

میں یعنی فراقؔ اپنی صبحِ شبِ ہجراں ہوں

جنونِ کارگر ہے اور میں ہوں
حیاتِ بے خبر ہے اور میں ہوں

مٹا کر دل نگاہِ اوّلیں سے
تقاضائے دگر ہے اور میں ہوں

مبارک یادِ ایّامِ اسیری
غمِ دیوار و در ہے اور میں ہوں

تری جمعیتیں ہیں اور تو ہے
حیاتِ منتشر ہے اور میں ہوں

ٹھکانا ہے کچھ اس عذرِ ستم کا
تری نیچی نظر ہے اور میں ہوں

فراقؔ ایک ایک حسرت مٹ رہی ہے
یہ ماتم رات بھر ہے اور میں ہوں

مٹتا بھی جا رہا ہوں بڑھتا بھی جا رہا ہوں
میں کس کی آرزو ہوں میں کس کا مدعا ہوں

کچھ کام عاشقی کے بگڑوں نے بھی سنوارے
میں قیس و کوہکن کی تقدیر سوچتا ہوں

ہستی و نیستی میں مشکل ہے فرق کرنا
میں بن گیا سراسر یا مٹ کے رہ گیا ہوں

آگے ترے کسی سے کیا کیا شکایتیں تھیں
منہ دیکھ کر کسی کا اللہ رہ گیا ہوں

کیفِ فنا بھی مجھ میں کیفِ بقا بھی مجھ میں
میں کس کی ابتدا ہوں میں کس کی انتہا ہوں

منزل کی یوں تو مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
دل میں کسی طرف کو کچھ سوچتا چلا ہوں

محشر میں ساتھ میرا اب چھوڑتے نہیں ہیں
اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں یہ بھی خبر نہیں ہے
میں کیا کہوں کہاں ہوں میں کیا بتاؤں کیا ہوں

ہاں اے فراقؔ یونہی کچھ جی میں آ گئی تھی
یہ رازِ دل تھے جن کو باتوں میں کہہ گیا ہوں

نکھری نکھری ہوئی جوانی دمِ صُبح
آنکھیں ہیں سکون کی کہانی دمِ صُبح

آنگن میں سُہاگنی اُٹھاتے ہوئے بانہہ
تلسی کو دے رہی ہے پانی — دمِ صُبح

نگہ ناز سے وہ نغمہ سنا آج مجھے
نہ رہے شورشِ عالم کا پتہ آج مجھے

سربسر سازِ محبت ہے مرا رنگِ سکوت
شوخیِ چشمِ سیہ چھیڑ ذرا آج مجھے

اس طرح بزمِ طرب کو بھی نہیں چمکاتے
درد کی طرح نہ محفل سے اُٹھا آج مجھے

قرب و دوری کے بھرم کھل گئے اے گردشِ بخت
آمدِ دوست پہ جی بھر کے رُلا آج مجھے

اے غمِ دوست ستاروں کی ہیں پلکیں بھاری
تو بھی سو جائے وہ افسانہ سُنا آج مجھے

کتنے روزوں کی ملاقات کی ہے آخری شام
وقت کیا چیز ہے معلوم ہُوا آج مجھے

بھول پائیں نہ ترے رنگِ تغزل کو فراق
درد کے ساز پہ وہ نغمہ سنا آج مجھے

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

کٹتی یُوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

جگانے والے نغمۂ سحر لبوں پہ موجزن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

رفتہ رفتہ موت کی نیند آ گئی ہنگامِ ناز
سو گئے افسانۂ بیدردیِ قاتل سے ہم

اب نگاہِ لطف کی سعیِ تشفّی ہو چکی
ورنہ یوں مایوس ہوتے تھے ذرا مشکل سے ہم

کٹ گئی اے بحرِ غم موجوں سے ہنستے کھیلتے
بہتے بہتے دیکھ آخر آ لگے ساحل سے ہم

زمانے بھر میں محبّت کا نام روشن ہے
اسی چراغِ سرِ رہگذر کو دیکھتے ہیں

نہ سرد ہو سکے آتشکدے محبّت کے
بجھے دلوں میں بھی رقصِ شرر کو دیکھتے ہیں

فراقِ یار کی تجدید صبحِ کاذب ہے
غمِ دراز و شبِ مختصر کو دیکھتے ہیں

لہک اُٹھی ہیں فضائیں جدھر اُٹھی وہ نگاہ
بہشت کے چمنِ منتظر کو دیکھتے ہیں

غبارِ راہگذر کارواں سے آگے ہے
سفر کو دیکھ کے اہلِ سفر کو دیکھتے ہیں

نہ ہم جگر کو نہ سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے کرشمۂ برقِ نظر کو دیکھتے ہیں

ہر آسمانِ سرِ رہگذر کو دیکھتے ہیں
ترے خرامِ قیامت اثر کو دیکھتے ہیں

کہیں نہ چونک اُٹھیں غفلتیں محبّت کی
بچا بچا کے دلِ بے خبر کو دیکھتے ہیں

وہ رنگ زاہدِ شب زندہ دار کیا جانے
جو اہلِ میکدہ پچھلے پہر کو دیکھتے ہیں

خوشا بیابانِ تمنّا کہ اب ہے قرب بھی بُعد
کدھر کو دیکھ رہے تھے کدھر کو دیکھتے ہیں

سُبک روی میں بھی بوجھل ہیں حُسن کے شلنے
قدم قدم پہ لچکتی کمر کو دیکھتے ہیں

سرے سے چیر گئی ہے دلِ وجود و عدم
کہاں کہاں نگہِ کارگر کو دیکھتے ہیں

سفید پھول زمیں پر برس پڑیں جیسے
فضا میں کیفِ سحر ہے جدھر کو دیکھتے ہیں

ابھی تو اپنی خبر بھی نہیں اسیروں کو
ابھی تو سختیِ دیوار و در کو دیکھتے ہیں

ابھی تو سوچیں گے ہم دردِ لا دوا کا علاج
ابھی تو بیخودیِ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

ابھی تو حدِ نظر مہر و ماہ و انجم ہیں
ابھی تو گردِ سرِ رہگذر کو دیکھتے ہیں

ابھی تو قلب و جگر کی خبر کسی کو نہیں
ابھی تو لوگ کسی کی نظر کو دیکھتے ہیں

ابھی تو قافلے کچھ دن رہیں گے سرگرداں
ابھی تو گمرہیٔ راہبر کو دیکھتے ہیں

ابھی حیات کو مجبوریوں کا دھوکا ہے
ابھی فریبِ قضا و قدر کو دیکھتے ہیں

کسی کی آنکھ میں ملتے ہیں دونوں وقت فراقؔ
ہم اک نگاہ میں شام و سحر کو دیکھتے ہیں

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں

مدّتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیّاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ انکار سے تھے
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

کہہ دیا تو نے جو معصوم تو معصوم ہیں ہم
کہہ دیا تو نے گنہگار گنہگار سے ہیں

سرفروشانِ محبّت پہ ہیں احسان ترے
تیرے ہاتھوں یہ سبکدوش گراں بار سے ہیں

خیر خوش ہو لے اشاراتِ نہاں سے کوئی روز
آشنا ہم بھی کچھ اے دل نگہِ یار سے ہیں

شکوۂ جور و تقاضائے کرم سب بیسود
کیوں مگر پردۂ انکار میں اقرار سے ہیں

وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی دل ہے لیکن
کچھ نہ کچھ سب کے بدلتے ہوئے آثار سے ہیں

جس کو دکھنے کی طرح آئے نہ دُکھنا بھی فراقؔ
تنگ آئے ہوئے ہم تو دلِ بیمار سے ہیں

ہو کر عیاں وہ خود کو چھپائے ہوئے سے ہیں
اہلِ نظر یہ چوٹ بھی کھائے ہوئے سے ہیں

ذوقِ نظر حدودِ فنا سے بڑھائیے
اہلِ ہوس بھی خود کو مٹائے ہوئے سے ہیں

وہ طور ہو کہ حشرِ دلِ افسردگانِ عشق
ہر انجمن میں آگ لگائے ہوئے سے ہیں

صبحِ ازل کو یونہی ذرا لڑ گئی تھی آنکھ
وہ آج تک نگاہ چرائے ہوئے سے ہیں،

حسّاس کس قدر ہے محبّت کی زندگی،
ہم بے خبر ہیں اور انہیں پائے ہوئے سے ہیں

وہ سر بسر نہاں وہ سر تا قدم حجاب
پھر بھی ہر اک نظر میں سمائے ہوئے سے ہیں

شاید کچھ اس میں شوخیٔ بیگانگی بھی ہے
ربطِ نہاں وہ آج بڑھائے ہوئے سے ہیں

ہم بدگمانِ عشق تری بزمِ ناز سے
جا کر بھی تیرے سامنے آئے ہوئے سے ہیں

سنتے ہیں باخبر بھی ہیں تیرے ادا شناس
در پردہ کچھ فریب بھی کھائے ہوئے سے ہیں

بادل سے اپنے دل پہ جو چھائے ہوئے سے ہیں
اگلے زمانے یاد کچھ آئے ہوئے سے ہیں

بس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر ابھر نہ آئیں
وہ نقشِ آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں

تقریبِ دید ہیں غمِ ہجراں کی شدتیں
محسوس ہو رہا ہے وہ آئے ہوئے سے ہیں

جانِ نشاط بھی ہیں خزاں دیدگانِ عشق
کچھ شوخیٔ بہار اڑائے ہوئے سے ہیں

یہ قرب بعد بھی ہیں سراسر فریبِ حسن
وہ آ کے بھی فراقؔ نہ آئے ہوتے سے ہیں

پہلے اپنا تو اعتبار کریں — پھر ترا عہد استوار کریں
کوئی آیا نہ آئے گا لیکن — کیا کریں گر نہ اعتبار کریں
وہ رہی سرحدِ زمان و مکاں — کیا ابھی اور انتظار کریں
عشق اپنی سی کر چکا سب کچھ — اب توجہ ہو رِ ثنائے یار کریں

شامِ فرقت بھی اک سحر ہے فراقؔ
کیا گریباں کو تار تار کریں

غم زدا جس میں تھا وہ دل کیونکر / وقف غم ہائے روزگار کریں

ٹوٹتا ہے طلسمِ نظمِ حیات / صبر کچھ جلوہ ہائے یار کریں

کہتے ہم تیری داستانِ ستم / لوگ شاید نہ اعتبار کریں

شوخیاں جنکی اِک قیامت ہیں / کیا اُن آنکھوں کو شرمسار کریں

ہم کو اپنا ہی اعتبار نہیں / خیر تیرا تو اعتبار کریں

وہ نہ آئیں گے تو فراق ہمیں
کام ہی کیا ہے انتظار کریں

جلوۂ حسن نشاطِ غمِ پنہاں کر دے
عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کر دے

تجھ کو اے موجِ صبا شوخیٔ پیہم کی قسم
اس طرح چھیڑ کہ ہر گل کو گلستاں کر دے

یوں تو ظلمات سرا ہے یہ سیہ مستیٔ عشق
لیکن ایسا اسے چمکا کہ چراغاں کر دے

حسن کی شان توجہ کے بہت ہیں عنواں
خیر غفلت ہی کا شرمندۂ احساں کر دے

پھونک دے پھونک دے اے سوزِ نہاں سارے حجاب
حسنِ مستور کو اک شعلۂ عریاں کر دے

کچھ بڑھا دے تو عدم ہو یہی دامانِ نظر
کچھ گھٹا دے تو سراپردۂ امکاں کر دے

دیکھ وحدت ہے نہ کثرت نہ عدم ہے نہ وجود
کیوں یہ چاہا تھا کہ ذرّے کو بیاباں کر دے

لبِ اعجاز کی تجھ کو قسم اے جانِ بہار
اک تبسّم کہ گلستاں کو گلستاں کر دے

قرب و دوری سے الگ جلوہ گری حُسن کی ہے
اب اسے وصل سمجھ یا غمِ ہجراں کر دے

مُنہ چھُپانے کا یہ عالم کہ نہ دیکھا نہ سُنا
خود نمائی کا یہ انداز کہ حیراں کر دے

مژۂ یار میں اس کاوشِ پنہاں کے نثار
اس طرح چھیڑ کہ رگ رگ کو رگِ جاں کر دے

زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل
اب اسے اے نگہِ یار کچھ آساں کر دے

تا بکے تیرگیٔ دہر نہ جائے گی فراقؔ
جلوۂ عشق سیہ کار نمایاں کر دے

تو تھا یا کوئی تجھ سا تھا
میری راہ میں کون کھڑا تھا

کون بتائے عشق میں تیرے
دُکھ کتنا تھا سُکھ کتنا تھا

کیا دھرا سب سامنے آیا
میں پہلے سے دیکھ رہا تھا

وادی وادی جنگل جنگل
جیسے کوئی چلا آتا تھا

میں بھی تھا سچّا تم بھی تھے سچّے
عشق میں سچ ہی کا رونا تھا

روتے روتے فراقؔ ہجر میں
کوئی اکثر ہنس پڑتا تھا

تجھے بھلائیں تو نیند آتے آتے رہ جائے — کوئی ادھوری کہانی سی جیسے کہہ جائے

اُسی پہ آئینہ شاید ہو کچھ نزاکتِ وقت — تری نگاہ کی جو نرم چوٹ سہہ جائے

نگاہِ ناز کے آثارِ انقلاب نہ پوچھ — کہیں یہ قصرِ زمان و مکاں نہ ڈھہ جائے

کہاں کہاں سے چمک جائے عشق کی تقدیر — کہاں کہاں نگہہ نرگسِ سیہ جائے

کھُلے ہیں رمز و کنایاتِ زندگی اس طرح — تری نگاہ کی یاد آ کے جیسے رہ جائے

کبھی کبھی تو جفائے کرم نما کی ادا — کبھی کبھی تو ہماری بھی بات رہ جائے

تو دن کی طرح حسیں رات کی طرح پُر کیف — جہاں بھی جائے باندازِ مہر و مہ جائے

وہ رات! گوش بر آواز تھے جب انجم و مہ — تری نگاہ کہانی سی جیسے کہہ جائے

وہ رنگِ رُخ تھا اٹھائی ہے جب نگاہ اُس نے — شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے

نگاہِ مست تری تھاہ کوئی پا نہ سکا
فراقؔ ہی کی نظر ہے جو تہ بہ تہ جائے

مجھ سے شاکی نہیں، سنا؟ ہیں آپ ؟
آخر اس درجہ کیوں خفا ہیں آپ

میری ہر بات یوں نہ مانتے تھے
خوش ہیں؟ ناخوش ہیں؟ آج کیا ہیں آپ

حُسن کی اُف ری کیف سامانی
نغمہ ہیں، رنگ و بو ہیں، کیا ہیں آپ

پڑ گئی سازِ کائنات میں جان
وہ گلِ نغمہ، وہ صدا ہیں آپ

کون جانے کہ ہے حقیقت کیا
ہاں مگر جانِ ماسوا ہیں آپ

ابھی کتنے تھے مہرباں اور ابھی
دیکھتا ہوں تو کیا سے کیا ہیں آپ

شاکیٔ عشق اتنے ہم بھی نہیں
جتنے آزردۂ وفا ہیں آپ

اُن کے غم کا یقیں نہیں آتا
جن کے دُنیا میں آسرا ہیں آپ

آ گئی لو فراق کی بھی خبر
کُھل گیا درد بے دوا ہیں آپ

جو آنکھ رازِ محبت نہ آشکار کرے — کسے یقین ہو، کون اُس کا اعتبار کرے

ہم اہلِ درد کو تسکین یاس بھی نہ رہی — جو عشق نے نہ کیا تھا وہ حسنِ یار کرے

نگاہِ شوخ اِس انداز سے اُٹھی گویا — نہ بیقرار کیا ہے، نہ بے قرار کرے

وہی تو وقت ہے، کٹنا اِسی کو کہتے ہیں — ترا فراق جسے شامِ انتظار کرے

فضائے عشق بسانا اسی کو آتا ہے — جو اپنے رنگِ پریدہ کو بوئے یار کرے

سکونِ جان چھٹے کُشتۂ تغافلِ دوست — نصیبِ خفتہ کچھ اب اُن کو ہوشیار کرے

خبر نہ حسن و محبت کو ہو نگاہ تری — جب اہلِ درد کے دل کا کشودِ کار کرے

حجابِ سازِ چمن ہے وہی پیامِ نہاں — سکوتِ ناز جسے نغمۂ بہار کرے

فراقؔ ہوش میں آنا ہمیں بھی ہے لیکن
کسے یہ درد ہے کون اس کا انتظار کرے

پھر آج اشک سے آنکھوں میں کیوں ہیں آئے ہوئے
گذر گیا ہے زمانہ تجھے بھُلائے ہوئے

کسی سے بات بہر حال رہ بنائے ہوئے
کچھ آزمائے ہوئے کچھ فریب کھائے ہوئے

کسی کی شوخیٔ پنہاں میں یہ نکھار نہ تھا
فسردہ دل بھی ہیں کچھ آج رنگ لائے ہوئے

جنہیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پہ ساقی
تری نگاہ ہے انداز اُن کے پائے ہوئے

جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اُکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی
چراغِ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے

ہے ختم زندہ دلی اہلِ ضبط پر تیرے
کہاں کے درد دلوں میں ہیں یہ دبائے ہوئے

یہ حسرتیں ہیں کہ مایوسیاں کہ یاد تری
کچھ ابر سے دلِ افسردہ پہ ہیں چھائے ہوئے

تپاں تپاں سے ہیں کچھ آج رنگ و بُو والے
یہ کس کے سوزِ نہاں کی ہیں آنچ کھائے ہوئے

وہی ہیں رونقِ ہستی وہی ہیں جانِ نشاط
اُداس بیٹھے ہیں جو تیری کو لگائے ہوئے

وہ جامِ صاف ہیں زہرابہ بقا ساقی
وہ ہوش اُڑے ہوئے وہ ہاتھ تھرائے ہوئے

قتیلِ چشمِ تغافل سکوں شناس بھی ہیں
تری نگاہِ کرم کی تہیں ہیں پائے ہوئے

نہ رہزنوں سے رُکے راستے محبّت کے
وہ قافلے نظر آئے لُٹے لُٹائے ہوُئے

اب اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں اُنکی
دل آشنا ہوئے، اپنے ہوئے، پرائے ہوئے

اب اضطراب سا کیوں ہے، کہ مدّتیں گذریں
تجھے بھُلائے ہوئے تیری یاد آئے ہوئے

خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو
ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے

نہ ہے وہ موجِ تبسّم وہ آج جب گزرے
نظر بچائے ہوئے، تیوریاں چڑھائے ہوئے

جو کھوئے کھوئے سے ہیں منزلِ محبّت میں
وہ حُسن کا بھی ہیں کم کم سراغ پائے ہوئے

جو امتحانِ محبت سے دُور ہیں گو سول
اُنہیں بھی ہے کوئی در پردہ آزمائے ہوئے

دعا کریں نہ وہی صبر و ضبطِ عشق، جو ہیں
ہزار بار مصیبت میں کام آئے ہوئے

دلِ حزیں، تری مایوسیاں قیامت ہیں
سکوتِ ناز ہے صد پیچ و تاب کھائے ہوئے

نہ جانے کیا یہ فسردہ دلوں کو سوجھی ہے
کہ چار سمت ہیں اِک آگ سی لگائے ہوئے

ملے اُنہیں سے یہ اعجازِ قرب و دُوری کو
نظر سے دُور نظر میں ہیں جو سمائے ہوئے

نگاہِ اہلِ محبّت اُٹھی کِسی جانب
غم و نشاطِ زمانہ کے بھید پائے ہوئے

زمانہ بھُول گیا، بس وہی نہیں بھُولے
گذر گئی جنھیں اِک عمر یاد آئے ہوئے

خبر یہ ہے کہ سرِ حشر بھی نہیں چُوکے
تری نگاہِ کرم کے فریب کھائے ہوئے

سمجھ کے کچھ دلِ غم آشنا جو ڈوب گئے
وہی تھے تیری نگاہوں سے پیار پائے ہوئے

بہت لطیف اشارے ہیں دورِ حاضر کے
کچھ آج اہلِ سکوں بھی ہیں تلملائے ہوئے

نثار کرنے کو تجھ پر کہاں سے لائیں خوشی
یہی ہیں کچھ غمِ پنہاں بچے بچائے ہوئے

وہی ہیں محویتیں آج تک زمانے کی
وہی فسانۂ غم ہیں سُنے سُنائے ہوئے

مقدّروں کے بدلنے سے تجھ کو کیا لیکن
یہ کام کس نے بگاڑے بنے بنائے ہوئے

یہ شادکامِ محبّت، یہ رازدانِ نشاط
یہ لوگ اپنے لہو میں ہیں کیوں نہائے ہوئے

پھر آج اے نگہِ یاس چھیڑ ان آنکھوں کو
کہ مدّتیں جنہیں گذری ہیں مسکرائے ہوئے

ہوا نہ جن کی کبھی پا سکیں حیات و ممات
دلوں میں ایسے بھی کچھ درد ہیں سمائے ہوئے
فراقؔ تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبّت کی چوٹ کھائے ہوئے
دلِ فراقؔ کا عالم نہ پوچھ، اُٹھی جس دم
تری نگاہِ محبّت قسم سی کھائے ہوئے

کہوں میں دل کی جہاں کوئی واردات ہوئی
حیاتِ تازہ سے لبریز کائنات ہوئی
چراغِ شامِ غریباں بھی جھلملا کے بجھے
مسافروں کو نئی منزلوں میں رات ہوئی
تمہیں نے باعثِ غم بارہا کیا دریافت
کہا تو روٹھ گئے، یہ بھی کوئی بات ہوئی

شریکِ رسمِ محبت ہے رسمِ دنیا بھی
نگاہِ لطف بھی صرفِ تکلفات ہوئی
بہک کے ہو گئے خود اپنی منزلِ مقصود
ہماری گمرہی بڑھ کر رہِ نجات ہوئی
حیات رازِ سکوں پا گئی، اجل ٹھہری
اجل میں تھوڑی سی لرزش ہوئی، حیات ہوئی
شبِ فراق میں اُٹھے حجابِ یاس و اُمید
تمام عمر میں بس ایک ہی تو رات ہوئی
بقا پیام لبوں کا، فنا فسونِ نظر
فسانۂ دو جہاں اُس کی ایک بات ہوئی
تھی ایک کاوشِ بے نام دل میں فطرت کے
سوا ہوئی تو وہی آدمی کی ذات ہوئی
یہ کائنات خود اپنے میں ڈوب کر اُبھری
بڑے کرشمے ہوئے ہیں تو رات رات ہوئی

دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

جہانیوں پہ درِ خُلد کھُل کے بند ہوئے
نہ جب نجات ہوئی تھی نہ اب نجات ہوئی

ہزار رنگ غمِ جاوداں نے بھی بدلے
ابد کی شام بھی وقفِ تغیّرات ہُوئی

بہت دنوں میں محبّت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی

کہاں یہ رنگ پشیمانیوں سے پیدا تھا
ادائے جور بھی رشکِ صد التفات ہوئی

ہر اک کی پرسشِ خاطر ہر اک کا پاسِ ملال
نگاہِ لطف تری صرفِ رسمیات ہوئی

ہزار دیدۂ انجم کھُلے مگر تجھ سے
نظر ملی تو کہیں زندگی کی رات ہوئی

فراقؔ کو کبھی اتنا خموش دیکھا تھا   ضرور اے نگہِ ناز کوئی بات ہوئی

حدِ دنیا عدم اور لامکاں دُور — کچھ اس سے اور اے عمرِ رواں دُور
اسیرو! بھید ہے یہ قسمت کا ورنہ — قفس سے کس قدر ہے آشیاں دُور
محبّت بے نیازِ پرسشِ غم — نگاہِ لطف سے ناکامیاں دُور
زمانہ چھپتا جاتا ہے نظر سے — لئے جاتی ہے یادِ رفتگاں دُور
نصیبِ آرزو جو کچھ سنا دے — "نہیں" ہے دُور اُس لب سے نہ "ہاں" دُور
زمانے میں نہ ڈھونڈھ اہلِ فنا کو — کہ ملتے ہیں نشانِ بے نشاں دُور
کہاں تو اور کہاں غم خانۂ عشق — یہ کون آیا گمانِ بدگماں دُور؟
شبِ فرقت کے سنّاٹوں میں اکثر — صدا آتی ہے میں تجھ سے کہاں دُور؟

فراقؔ اس کو وفا سے کد نہیں ہے
نہ لے جا اس قدر وہم و گماں دُور

ہوئے سب مہرباں نامہرباں دُور — یہ مجبوری! زمیں سخت، آسماں دُور

نشاط و غم سے دل کے پرے اڑے ہیں — ان آنکھوں کے اشاراتِ نہاں دُور

نظر کو ترجمانِ غم نہ کیجے — کہ پہنچے گی یہ شرحِ داستاں دُور

نہ کر پسماندگاں سے ذکرِ منزل — ابھی تو ہے غبارِ کارواں دُور

قفس والوں کی بھی کیا زندگی ہے — چمن دُور، آشیاں دُور، آسماں دُور

ذرا صبر اے حیاتِ دورِ حاضر — نہیں اتنی بھی مرگِ ناگہاں دُور

یہ کیا وحشت یہ شوریدہ سری کیا؟
فراقؔ اس کا ابھی ہے آستاں دُور

کوئی رگِ دلِ افسردہ آج پھر اکساؤ
پھر آج غم کے شبستاں میں اک چراغ جلاؤ
یہ امتزاج تو دیکھو سکون و لرزش کا
نظر فریب ہے کیا حُسن کے خطوں کا کھنچاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حُسن ہی جانے
کسی سے عالمِ مستی میں اس طرح کھل جاؤ
جہاں میں ہے بڑی چیز خود فریبیٔ عشق
کسی کا عہدِ وفا جھوٹ ہی ہو مان بھی جاؤ
اگر مصائبِ دنیا کو دُور کرنا ہے
کچھ اپنی اپنی مصیبت سے بے خبر ہو جاؤ
فلک پہ گوش بر آواز ہیں ستارے بھی
ہے رات کتنی سہانی کوئی فسانہ سناؤ

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں
گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ
کہو دیارِ محبّت کے رونے والوں سے
ہزار فتنے اُٹھاؤ اس آنکھ کو نہ جگاؤ
نہ پوچھ اُلجھی ہوئی گتھیاں محبّت کی
نہ پوچھ حُسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
کہاں پھر اس کی نظر کی یہ کیف سامانی
چھڑا ہے نغمۂ سازِ حیات جھوم بھی جاؤ
بساطِ ناز پہ تُو ہے کہ کوئی دیوی ہے
بھوؤں کی نرم لچک، انکھڑیوں کا نرم جھکاؤ
لہو کی بُوند ہے دل شانِ مد و جزر تو دیکھ
کسی ندی کا ہو جیسے اتار اور چڑھاؤ
کرو نہ گریۂ معصومِ عشق کو رسوا
چمکتے جھوٹ سے پانی میں تو نہ آگ لگاؤ

۲۔ اگرچہ سادہ تھا کتنا گناہ آدم کا
وہ رنگ لائے گا کیا کیا ابھی تو دیکھتے جاؤ

بجا یہ ترکِ محبّت، بجا یہ عزمِ محال
کسی کو خیر نہ اب چاہنا قسم تو نہ کھاؤ

بجا ہے ایسے ہی نازک سمے میں اُٹھنا تھا
جو بے قرار ہوں اتنا سنبھل بھی جاؤں گا جاؤ

نسیم کب تک الجھتی رہے گی گیسوؤں سے
ہوا کو اب سوئے گم گشتگانِ غم سنکاؤ

تڑپ کو ہم نے بنایا سکونِ بے پایاں
ہماری دکھ بھری لَے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

فراقؔ اِس کی محبّت سے باز کیوں آؤں
اب اس میں ایک جہاں سے بگاڑ ہو کہ بناؤ

سُنا تو ہے کہ کبھی بے نیازِ غم تھی حیات
دلائی یاد نگاہوں نے تیری کب کی بات

حیات بن گئی تھی جن میں ایک خوابِ حیات
ارے دوام و ابد تھے وہی تو کچھ لمحات

حیاتِ دوزخیاں بھی تمام مبہم ہے
عذاب بھی نہ میسّر ہوا کہاں کی نجات

تری نگاہ کی صبحیں نگاہ کی شامیں
حریمِ راز یہ دنیا جہاں نہ دن ہیں نہ رات

بس اک شرابِ کہن کے کرشمے ہیں ساقی
نئے زمانے نئی مستیاں نئی برسات

سکوتِ راز وہی ہے جو داستاں بن جائے
نگاہِ ناز وہی جو نکالے بات میں بات

تمام عکس ہے دنیا، تمام عکس عدم
کہاں تک آئنہ در آئنہ حیات و ممات
بس ایک رازِ تسلسل بس اک تسلسل رازِ
کہاں پہنچ کے ہوئی ختم بحثِ ذات و صفات
چمکتے درد، کھلے چہرے، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات
جسے سب اہلِ جہاں زندگی سمجھتے ہیں
کبھی کبھی تو ملے ایسی زندگی سے نجات
اگر خدا بھی ملے تو نہ لے، ارے ناداں
ہے تو ہی کعبۂ دیں تو ہی قبلۂ حاجات
تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے یہ ستارے تھکی تھکی سی رات
تیری غزل تو نئی روح پھونک دیتی ہے
فراقؔ دیر سے چھوٹی ہوئی ہے نبضِ حیات

موت اِک گیت رات گاتی تھی زندگی جھوم جھوم جاتی تھی
حُسن کے آنسوؤں کی یاد آئی زندگی جن میں مسکراتی تھی
کبھی دیوانے رو بھی پڑتے تھے کبھی تیری بھی یاد آتی تھی
ذکر تھا رنگ و بُو کا اور دل میں تیری تصویر اُترتی جاتی تھی
وہ ترا غم ہو یا غمِ آفاق شمع سی دل میں جھلملاتی تھی
کروٹیں لے اُفق پہ جیسے کوئی صبح اس طرح رسمساتی تھی
وجدِ پیہم میں تھا فضا کا دماغ بُوئے گیسوئے یار آتی تھی
تھے نہ افلاک گوش بر آواز بیخودی داستاں سُناتی تھی
زندگی کو رہِ محبّت میں موت خود روشنی دکھاتی تھی
روتے جاتے تھے تیرے ہجر نصیب رات فرقت کی ڈھلتی جاتی تھی
غم کی وہ داستانِ نیم شبی آسمانوں کو نیند آتی تھی
جلوہ گر ہو رہا تھا کوئی اُدھر دھوپ اِدھر پھیکی پڑتی جاتی تھی
زندگی خود کو راہِ ہستی میں کارواں کارواں چھپاتی تھی
ہمہ تن گوش زندگی تھی فراقؔ موت دھیمے سروں میں گاتی تھی

نظر نظر میں نہاں داستانِ امین ہے
ادا ادا میں ستاروں کے دل کی دھڑکن ہے
خرامِ ناز میں موجِ نسیم کی ہے لچک
نگاہِ ناز نوائے بہارِ گلشن ہے
وہ جلوے جسم کے ہیں دھوپ پھیکی پڑتی ہے
چھپاتے منہ مہِ کامل وہ رنگ و روغن ہے
تجھی سے رونقِ بزمِ حیات ہے اے دوست
تجھی سے انجمنِ مہر و ماہ روشن ہے
تری نظر سے عبارت جہاں کے نقش و نگار
یہ کائنات شعاعِ نگاہِ پُر فن ہے
پکارتا ہے لہو کام آنے والوں کا
حیاتِ عشق نہیں بولتا ہوا دن ہے

تمام بزمِ طرب نُور میں نہائی ہوئی
کہ آج چاندنی راتوں کا تجھ پہ جوبن ہے
یہ رات آئی لئے شمع جھلملاتی ہوئی
ترا خمارِ بدن آہوؤں کا مسکن ہے
ہوا سنکتی ہوئی رات جگمگائی ہوئی
یہ آہیں ہیں تری ہی ترا ہی دامن ہے
جو مہکی چھاؤں میں نغموں کی نکھڑی سے بنے
وہی سُنا ہے ترے حُسن کا نشیمن ہے
یہ بزمِ دوست میں آتش نوائیاں تیری
فراقؔ تجھ سے محبت کا نام روشن ہے

صدائے صورِ محشر بھی جگانے کی اذاں کیوں ہو
دوبارہ امتحانِ خاکِ خاک آسودگاں کیوں ہو
نگاہِ ناز کی تو ایک رَوِ اِک موج کافی تھی،
یہ سیلِ کیف و مستی کارواں در کارواں کیوں ہو
یہ باتیں تو فقط نشو و نما کا اِک بہانہ ہیں
مسلسل ارتقا میں کاوشِ سود و زیاں کیوں ہو
رہینِ اوج و پستی کب ہوئیں معراج کی راہیں
فرشتوں کی زمیں کیوں ہو، بشر کا آسماں کیوں ہو
حقیقت کو ہی یہ چوٹیں اُبھاریں گی نکھاریں گی
نگاہِ نارسا تیری نگاہِ رائگاں کیوں ہو
جمالِ یار کو اے جمالِ یار رہنے دے
زِ سر تا پا وہ لطفِ بیکراں ہو، مہرباں کیوں ہو

کبھی سازِ طرب سُن کے بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
نوائے شاعرِ فطرت الم کی داستاں کیوں ہو

مرے دل کی یہ کیوں پرچھائیاں سی پڑنے لگتی ہیں
ترا جب سامنا ہو تو محبت درمیاں کیوں ہو

وہی دل شادماں بھی ہے اسی دل میں نہیں کھلتا
نگاہِ لطف کے اُٹھتے ہی شورِ الاماں کیوں ہو

محبت کو حیاتِ محض ہو جانا ہی کافی ہے
محبّت غمزدہ کیوں ہو محبّت شادماں کیوں ہو

خدا ہو، ماسوا ہو، کفر ہو یا ایمان ہو، جو ہو
حقیقت ہی سہی لیکن فقط پرچھائیاں کیوں ہو

محبّت کا فسانہ تو زمانے کا فسانہ ہے
مگر نامِ فراقؔ اے دوست زیبِ داستاں کیوں ہو

آہ کب تو نے بے وفائی کی
بات الگ ہے غمِ جدائی کی

ایک تصویر تھی وصال کی رات
آپ کے لطف انتہائی کی

شانِ بیگانگی کا کیا کہنا
یہ ادا عالمِ آشنائی کی

کوئی افسانہ چھیڑ تنہائی
رات کٹتی نہیں جدائی کی

جلوۂ ہستیٔ جہاں کیا تھا
اک ادا تیری خود نمائی کی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تُو نے تو خیر بیوفائی کی

نزع میں یاد اسی کی آئی فراقؔ
عمر بھر جس نے بیوفائی کی

میری آواز کی رسائی دیکھ
موت نے وہ صدا لگائی دیکھ

داغ ہیں آستانِ آدم پر
آسمانوں کی جبہ سائی دیکھ

بن گئے ہیں گناہ کے مدفن
پارساؤں کی پارسائی دیکھ

اے نظامِ کہن کچھ آہٹ لے
وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ

ہجر میں تو فراق روتا تھا
اس کو پا کے غمِ جدائی دیکھ

رنگ لایا غمِ پنہاں دلِ شیدائی کا
پردۂ درد میں اب نام ہے رعنائی کا

اہلِ عالم جسے ہنگامۂ ہستی سمجھے
ہے اک انداز مرے عالمِ تنہائی کا

دامنِ دشت میں نیند آ گئی دیوانے کو
مرحلہ ختم ہوا بادیہ پیمائی کا

آستینیں سرِ گلزار لہو دینے نکلیں
جوشِ گل آہ یہ عالم چمن آرائی کا

رُخِ رنگیں سے ہو گلزار کو دعوائے جمال!
نام لے نکہتِ برباد نہ رعنائی کا

آج افسردہ فضا بوئے کفن دیتی ہے
منہ دھواں ہے مری شامِ شبِ تنہائی کا

ہم نے بھی موڑ لیا منہ دلِ سوزاں سے فراق
کون ہوتا ہے چراغِ شبِ تنہائی کا

دھوکا کھایا ہوگا نظر نے دل کو وہم ہوا ہوگا
تجھ کو دیکھا ہوگا کسی نے تجھ کو کیا دیکھا ہوگا

برقِ نظر جس وقت گری تھی عالم اور رہا ہوگا
سہما سہما عشق بھی ہوگا حُسن بھی کچھ جھجکا ہوگا

دل کا چھالا پھوٹ چلا تھا ہجر کی گھڑیاں آخر تھیں
کیسی صبح رہی ہوگی جب یہ تارا ٹوٹا ہوگا

درد میں بھی ایسی کیفیّت جنّت صدقے ہوتی ہے
اُس کی قسمت کیا کہیے جو جی بھر کے رویا ہوگا

مد بھری آنکھیں جھپک رہی تھیں عالم تھا سرمستی کا
اُف ایسے میں ساقی تُو نے جس کو جام دیا ہوگا

یوں تو اپنی رام کہانی کہہ کے فراقؔ نہ روتا تھا
آنکھیں جس سے بھر آئی تھیں نام ترا آیا ہوگا

نظر کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
نہ جانے کیا دکھائے اب یہ پردہ درمیاں ہو کر

نہ جانے رنگِ حُسن و عشق کیا ہو گا سرِ منزل
تمنائیں چلی ہیں کارواں در کارواں ہو کر

سکوتِ ناز کا عالم ہے خواب آگیں فضاؤں میں
خموشی بڑھ چلی ہے داستاں در داستاں ہو کر

لہو میں جوش ہو دل میں تڑپ ہو سر میں سودا ہو
جوانی وہ کہ آئے اِک بلائے ناگہاں ہو کر

نگاہِ شوق کی بے باکیاں بھی کیا قیامت ہیں
کہ رنگِ حُسن اُڑتا ہے بہارِ جاوداں ہو کر

بجا یہ میری مدہوشی مری یہ بے خودی برحق
یہ کِس کا مجھ کو رہ جاتا ہے اپنے پر گماں ہو کر
وہ کیا ڈوبیں جنہیں تر دامنی کی بھی نہ ہمّت ہو
سبکسارانِ ساحل چل دیئے دامن کشاں ہو کر
کِسی کے کھُل کے ملنے سے گزرتے ہیں گماں کیا کیا
تمنّا ہے کہ ملتا مجھ سے کوئی بدگماں ہو کر
فراقؔ اب ضبط کو بھی راہ دیں کچھ عشق میں کب تک
رہیں شوریدہ سر وارفتہ دل آشفتہ جاں ہو کر

وُہ جا بھی چکا کب کا، وُہ بھُول چُکا کب کا
دل ہے کہ فراقؔ اب تک دامن کو چھڑائے ہے

ہر انقلاب کے بعد آدمی یہ سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ بھر لے گی کروٹیں یہ زمیں

حیاتِ عشق کیا ہے؟ کارواں در کارواں ہونا
عدم اندر عدم ہوتا جہاں اندر جہاں ہونا
غبارِ کارواں یا نقشِ پائے کارواں ہونا
مری تقدیر میں تھا حسرتِ پس ماندگاں ہونا
مبارک دردِ آزادی سلامت دردِ آزادی
سکھایا سو طرح قطروں کو بحرِ بیکراں ہونا
ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی
بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا
مدد اے انقلابِ دائمی اب تک نہیں آیا
زمیں ہونا زمیں کو آسماں کو آسماں ہونا

ابھی "اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے"
ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رائگاں ہونا

وہ صبحِ وصلِ اوّل تو نہ اُٹھنا اُن نگاہوں کا
مگر جس وقت اُٹھ جانا تو پھر اِک داستاں ہونا

وہ شانِ بدگمانی جان و ایمانِ محبت تھی
نہ بھولے گا ترا وہ کچھ جھجک کر مہرباں ہونا

فراقؔ اک کیفیت تھی تیرگیِ شامِ ہجراں بھی
وہ ہستی کا چراغِ سوزِ پنہاں کا دھواں ہونا

دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں

آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا

وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں

نہ کیوں ہر آنکھ مایوسِ جمالِ یار ہو جائے
ترا دیدار بھی جب حسرتِ دیدار ہو جائے

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

اُٹھے ہستی کے پردے عالمِ وحشت ہی میں لیکن
کسی کی بیخودی۔ کیا ہو۔ اگر ہشیار ہو جائے

خضر لپٹے ہیں عمرِ جاوداں سے ہم یہ کہتے ہیں
گریبانِ عدم بھی کیوں گلے کا ہار ہو جائے

مزاجِ عشق میں بھی کارگر ہے حُسن کی شوخی
ابھی آسان ہو جائے ابھی دشوار ہو جائے

نگاہِ آشنا بھی اب تو بیگانہ سی لگتی ہے
کہاں تک اور جینے سے کوئی بیزار ہو جائے

وہ کیا غم ہے کہ جو چاہے وہی غمخوار ہو جائے
نگاہِ دوست بھی کیوں محرمِ اسرار ہو جائے

نظامِ دہر کیا ہو، آسماں کیا ہو، زمیں کیا ہو
جنوں کے بھیس میں کوئی اگر ہشیار ہو جائے

فراقؔ اک نالۂ بیتاب کب تک یاس و مجبوری
نقابِ شامِ غم اُلٹے سحر بیدار ہو جائے

دل بھی ششدر ہو گئے آنکھیں بھی حیراں ہو گئیں
سب ادائیں حُسن کی آئینہ ساماں ہو گئیں

پُرسشیں اربابِ غم کی ہو گئیں ہاں ہو گئیں
اُس نظر کی بجلیاں لہرا کے پنہاں ہو گئیں

خیر سے جب ہو چکی تکمیل تعمیرِ جہاں
کچھ بلائیں مل گئیں باہم اور انساں ہو گئیں

داستانِ جور و بیدردی کی سب رنگینیاں
حاصلِ خمیازۂ حُسنِ پشیماں ہو گئیں

ہو چکی تھیں کچھ سکون آور ادائیں حُسن کی
اِک نئے انداز سے پھر حشر ساماں ہو گئیں

زخمِ پنہاں کھل اُٹھے نوکِ مژہ کی چھیڑ سے
مسکرا کر آج یہ کلیاں گلستاں ہو گئیں
خاک اُڑتی ہے جہاں تھے اشک خونی موجزن
اُف وہ آنکھیں جو گلستاں سے بیاباں ہو گئیں
وہ بھی کوئی پنجۂ وحشت ہے جس کی وحشتیں
صرفِ داماں ہو گئیں صرفِ گریباں ہو گئیں
تیرے دیوانوں کو جن کی وسعتوں پر ناز تھا
وہ فضائیں کیوں در و دیوارِ زنداں ہو گئیں
پردے پردے میں پیامِ مرگ بھی لائیں فراقؔ
وہ نگاہیں جو اُترتے ہی رگِ جاں ہو گئیں

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

جام اُدھر چھلکے اِدھر راتیں درخشاں ہو گئیں
ظلمتیں لہرا کے سامانِ چراغاں ہو گئیں
شامِ صحرا ہو گئیں صبحِ گلستاں ہو گئیں
وحشتیں میری بہ ہر صورت نمایاں ہو گئیں
پھر سرشکِ خوں ہوئے آئینہ دارِ روئے یار
پھر مری آنکھیں گلستاں در گلستاں ہو گئیں
گُل بہاریں رنگ و بو کی کھنچ کے مرکز کی طرف
شوخیِ برقِ تبسم ہائے پنہاں ہو گئیں
ماورائے قرب و دُوری ہے یہ قولِ بے حسی
منزلیں غم کی نہ مشکل تھیں نہ آساں ہو گئیں
پھر تری زلفیں جنوں کے باندھ کر کچھ سلسلے
صورتِ شیرازۂ ہستی پریشاں ہو گئیں

ـــ دیدنی ہے عالمِ ہنگامہ زارِ زندگی
بستیوں کی بستیاں شہرِ خموشاں ہو گئیں

اِک صلائے عام بھی ہے اِک پیامِ راز بھی
حُسن کی باتیں نہ ظاہر تھیں نہ پنہاں ہو گئیں

تھیں ازل ہی سے نگاہِ اوّلیں ہیں وحشتیں
بڑھتے بڑھتے صبحِ ہستی کا گریباں ہو گئیں

آہ یہ زہرابۂ ہستی کی موجیں اور یہ پیاس
کیا کروں گا؟ گر یہ موجِ آبِ حیواں ہو گئیں

خود بقا ہستی تھی جن کو دیکھ کر انگڑائیاں
کیسی کیسی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں گرچہ تھیں اپنی جگہ لیکن فراقؔ
باعثِ صد امتیازِ کفر و ایماں ہو گئیں

اشک کی گلفشانیاں نہ گئیں — عشق کی شادمانیاں نہ گئیں
اب بھی ہے محوِ داستاں وہ نگاہ — میری جادو بیانیاں نہ گئیں
سرخوشی میں بھی چونک اُٹھتا ہوں — تیرے غم کی نشانیاں نہ گئیں
اب تو زعمِ وفا مجھے بھی نہیں — کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں
قصۂ غم حریفِ شامِ ابد — عشق کی بے زبانیاں نہ گئیں
دمِ رخصت بھی بے رُخی اتنی — آپ کی مہربانیاں نہ گئیں
جب ستم اب کرم کا ردنا ہے — عشق کی نوحہ خوانیاں نہ گئیں
موج نکلی لکیرِ ساحل کی — بحر کی بے کرانیاں نہ گئیں
دل ہے ڈوبا ہوا سا ضبط میں بھی — اشکِ غم کی روانیاں نہ گئیں
حشر کا آفتاب تھرّایا — تیری اُٹھتی جوانیاں نہ گئیں
خود الجھتا ہوں خود سلجھتا ہوں — دل کی ریشہ دوانیاں نہ گئیں
اُف یہ محویّتِ نگاہِ فراق — رات دن کی کہانیاں نہ گئیں

سانس ہے گرم و تیز سینے میں ہوئی جاتی ہے دیر جینے میں
پھونک ڈالے جو نظمِ کہنہ تمام آگ ایسی ہو تیرے سینے میں
ذرّہ ذرّہ ہے حاملِ کونین بحر خود غرق ہے سفینے میں
پڑ گیا عکس روئے جاناں کا آبِ حیواں ہے تر پسینے میں
تھرتھراتے ہیں ہاتھ کیوں صیّاد پر کترنے میں ہونٹ سینے میں
سمِّ قاتل کا آ رہا ہے مزا آج آبِ حیات پینے میں
تیرا مرنا ہو یا ترا جینا نہ یہ مرنے میں ہے نہ جینے میں
میرے دل میں ہے عکسِ رُخ تیرا کیا جھلک ہے اِس آبگینے میں
اور دُکھ ہو کہ ہجرِ دوست فراقؔ
آج کچھ درد سا ہے سینے میں

دل میں فراق پھر بھڑک اٹھی یہ کیسی آگ
دنیا سدا بہار محبّت سدا سہاگ
کچھ کچھ مجھے بھی سوزِ محبّت کی یاد ہے
وہ دھیمی دھیمی آنچ وہ دل میں دبی سی آگ
تو چونک اُٹھا تھا عشق کے خوابِ نشاط سے
اب وقت ہے کہ غم کے بھی خوابِ گراں سے جاگ
میں عشقِ بے نیاز ہوں تُو حُسنِ بے نیاز
بے لاگ دیکھ کتنی ہے یہ میری تیری لاگ
پھر مسکرا کے کھول رہا ہے کوئی کواڑ
پھر مدتوں کے بعد کھلے ہیں کسی کے بھاگ
وہ نو بہارِ ناز ہے آغازِ صد بہار
اِک ادھ کھلا سا غنچہ ہے اک ادھ سنا سا راگ

دل میں نشاطِ عشق کو میں پالتا تو ہوں
ڈر ہے کہ وقت پا کے کہیں ڈس نہ لے یہ ناگ

اہلِ وفا پر آج پھٹی پڑتی ہے بہار
خود اپنے اپنے خون سے کھیلا ہے سب نے پھاگ

اے ادھ کھلے کنول[1] جو کسی اور شکل سے
ہو جاگنا محال تو جادو ہی بن کے جاگ

بچنا ہے موت سے تو نہ کر زندگی کی فکر
جس رستے موت آئے اسی رستے تو بھی بھاگ

تیری صدا سے اب بھی ہے تاروں میں تھرتھری
لَو دے رہا ہے بند بھی ہونے کے بعد راگ

کیوں ہے اڑا اڑا سا ترا رنگِ رُخ فراقؔ
دنیا سدا بہار محبت سدا سہاگ

[1] اے ادھ کھلے کنول یعنی اے چشمِ نیم باز۔ خواہ مخواہ آنکھ کو نرگس ہی کیوں کہا جائے۔ — فراق

انقلاب کل ہو گا شاید آج تو اس کا وقت نہیں
کیوں انگڑائی لیتی ہے دنیا کیوں کروٹ لیتی ہے زمیں

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست
یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں

تو یوں ہی باتیں کرتا جا، سننے والے سنتے جائیں
بات تو یہ ہے تری بات پر کس کو ہو شبہ کس کو یقیں

سیرِ گلستاں کرتے جائیں نرم فضائیں ٹھنڈی ہوائیں
بوئے وفا بھی آجاتی ہے کبھی کبھی اور کہیں کہیں

کوئی ادا ہی جادو ہے جو عشق کو بس میں کر لیتا ہے
جور و کرم کی شرط نہیں ہے ہجر و وصال کی بات نہیں

کچھ تو بتاؤ چاند ستارو میں بھی ہوں اُس دُنیا میں
پل بھر کو بس آنکھ لگی پھر دیکھا وہ دُنیا ہی نہیں
کچھ بجلی سی کوند گئی یا سامنے سے کوئی گذرا
اڑ گئے تھے لہراتے شرارے ابھی ابھی اور یہیں کہیں
ہم بھی خوش تھے تم بھی تھے شاداں رات رہے تک جاگے تھے
آنکھ لگی تو خواب یہ دیکھا ہم بھی دُکھی تم بھی غمگیں
تو نے فراقؔ محبّت کا کیوں چارہ گروں سے ذکر کیا
جس کی دوا رکھتی ہو دنیا ناداں یہ وہ درد نہیں

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی
کسی سے چھوٹ کے شاد اور کسی سے مل کے غمیں
فراقؔ تیری محبت کا کوئی ٹھیک نہیں

پڑنے لگتی ہیں جبینِ چرخ پر جب سلوٹیں
لمحے اِس چکر میں پڑ جاتے ہیں اب کیونکر کٹیں

یہ ڈرانی آندھیاں، یہ بحر و بر کے زلزلے
یہ جماہی آسمانوں کی، زمیں کی کروٹیں

گردشِ افلاک کو بھی کچھ خبر ان کی نہیں
غم کے یہ دن رات بڑھ جانے ہی سے شاید گھٹیں

یہ اندھیرا گھپ کہ سورج، چاند، تارے لاپتہ
یہ دھواں گھٹتا ہوا، کالی کی بل کھائی لٹیں

موت کے گھوڑوں کے نتھنوں سے یہ شعلوں کی لپک
سہمی دُنیا میں یہ اُن کی بے تحاشا سرپٹیں

تھرتھراتا ہے اُفق پر شعلۂ بانگِ جرس
کاروانِ عہدِ نو کی مل رہی ہیں آہٹیں

اُٹھ رہے ہیں شش جہت سے نعرہ ہائے انقلاب
اہلِ دُنیا سے کہو اب جی اُٹھیں یا مر مٹیں[لہ]

زہر سے بڑھ کر تو قاتل جامِ عشرت تھے فراقؔ
اِن پیالوں کی نہ چکھیں اہلِ غم نے تلچھٹیں

[لہ] میں نے اِس قافیہ کو یہاں روا رکھا ہے۔ فراقؔ

گفتگو اور ہے عبارت اور
اِن نگاہوں کی ہے حکایت اور

کفر و ایماں سے رکھ معاف کہ ہم
رکھتے ہیں مذہبِ محبت اور

مستی و ہوش پر نہیں موقوف
نگہِ ناز کی ہے نیت اور

آج بھی نیند آئی جاتی ہے
یہ قیامت ہیں ہے قیامت اور

روز و شب کیا رُخ اور گیسو کیا
عشق کا نور اور ظلمت اور

کچھ نہ وحدت میں ہے نہ کثرت میں
اس کی خلوت ہے اور جلوت اور

شوخی و جور کیا، تغافل کیا
مجھ کو ہے حُسن سے شکایت اور

عشق بھی جرم، ترکِ عشق بھی جرم
یہ مصیبت ہیں ہے مصیبت اور

دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیوں
ہو گئی اہلِ دل کی حالت اور

دیکھ کر بھی اُسے نہ دیکھ سکے
بڑھ گئی ہے نظر کی حیرت اور

اُس سکوتِ نظر کی آج فراقؔ
داستاں اور ہے حکایت اور

طرزِ خرام کیا بتائے، رازِ نگاہ کیسے پائے
جیسے نسیم لڑکھڑائے، موجِ شراب تھرتھرائے

کاش کہ جھٹپٹے میں یوں تیرا خیال دل پہ چھائے
جیسے جبینِ چرخ پر کوئی ستارہ مسکرائے

وجہِ ملال بھی تو ہو حُسن بھی کس طرح منائے
اُف یہ مزاجِ عشق جو بیٹھے بٹھائے روٹھ جائے

غنچۂ نودمیدہ کو جیسے نسیم گدگدائے
دیکھ جمالِ یار کو جیسے حیات مسکرائے

جیسے فضائے بزمِ ناز ساز کی طرح تھرتھرائے
صوتِ نگاہِ یار سُن جیسے صدائے نغمہ آئے

اُس کی نگاہ اُٹھی ہے یا عشق کے کان بجتے ہیں
ناوکِ بے خطا کوئی جیسے فضا میں سنسنائے

ٹھہرے ہوئے ہیں قلب و جاں، ابروئے دوست الاماں
کھنچتی ہوئی کڑی کماں جیسے لچک لچک سی جائے

خلوتیانِ راز سے اُس کی نظر کا ہے پیام
لے کے نشاطِ حُسن کو درد میں ڈوب ڈوب جائے

اپنے مقام پہ رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو درِ خلد بھی کھُلے دل نے کہا کہ کون جائے

برقِ جمالِ یار یوں لہر پہ لہر لیتی ہے
دل کے کنول میں جس طرح شعلۂ عشق تھرتھرائے

جس کے لئے ہو بس وہی اِک سرِ رشتۂ حیات
آج اُسی کے ہاتھ سے دامنِ یار چھوٹ جائے

عالمِ حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھُولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے

مژدۂ دیدِ حُسن پہ دل ہے کہ امڈا آتا ہے
تیرا جمال ہو نہاں دیکھ کے آنکھ بھر نہ آئے

صاف اٹھی اُٹھی نہیں سینوں میں دل ہے چاک چاک
نرگس نیم وا کہیں اب یہ نظر اُتر بھی جائے

ق
آنکھوں میں انقلاب کا ایک سماں سا کھنچ گیا
کہتی ہے وہ نگاہ بھی گردشِ چرخ کیا دکھائے

چاروں طرف وہ رن پڑا دورِ قمر بدل گیا
اب یہ جہانِ غیر ہے اپنے جو تھے وہ کام آئے

جیسے حیات کی نگاہ دیتی ہو موت کا پیام
ہونٹوں پر آج موت کے جیسے حیات مسکرائے

دورِ قمر میں خیر و شر یوں ہیں جھلکتے آج کل
جیسے کہ وہ نگاہِ شوخ کھا کے قسم مکر بھی جائے

دیکھئے سنبھلے کس طرح آج تمدّنِ جہاں
تیز ہوا کی راہ میں جیسے چراغ جھلملائے

چونک کے حسن سے تو اور کھا گئے حسن کا فریب
گرچہ یہی کہا کئے جان کے دھوکے کون کھائے

اب تو دلِ تپاں کریں اپنی سلامتی کی فکر
برقِ نظر وہی کہ جو آگ لگا کے بھول جائے

دیکھ حیاتِ عشق کے رنگِ نشاط پر نہ جا
پائے اگر یہ زندگی موت بھی خون تھوک جائے

گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضد پہ آئے

کشتیٔ دل بچائیے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو، پار لگے تو ڈوب جائے

کھلنے کو ہے رُخِ نگار، عشق تمام انتظار
ہاں تو وہ حُسن کیا دکھائے ہاں تو وہ آنکھ کیا سنائے

عشق کے چھیڑنے سے پھر قصۂ زندگی چھڑا
اب تو زماں مکاں کی بھی ڈر ہے کہ آنکھ لگ نہ جائے

جستجوئے نشاط میں نکلے تھے کتنے کارواں
ان کے بھی ہاتھ کیا لگا، ہم تو فراقؔ باز آئے

کچھ پریشاں سے اہلِ دید بھی تھے　　گیسوئے یار کچھ بکھر بھی گئے
آپ کے انتظار میں جو تھے　　آپ آتے رہے وہ مر بھی گئے
حُسن کو کوئی روک سکتا ہے　　وہ اگر کچھ لحاظ کر بھی گئے
بات میں بات اور آئی نکل　　گر کبھی اُن کی بات پر بھی گئے
عشق میں روٹھ کر دو عالم سے　　نیا عالم ملا جدھر بھی گئے
عشق کو انتظارِ طوفاں ہے　　چڑھے دریا جو تھے اتر بھی گئے
کیا بتائیں زمین کی رفعت　　بارہا آسماں پر بھی گئے
گُل کھِل اُٹھے بوقتِ عہدِ وفا　　قطرے شبنم کے کچھ بکھر بھی گئے

کس لئے کم نہیں ہے دردِ فراق
اب تو وہ دھیان سے اتر بھی گئے

مٹ کے ہیں نے تجھ کو عالم میں نمایاں کر دیا
زندگی کی شمع گُل کر کے چراغاں کر دیا
کم نگاہی کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیا
درد کو اس طرح اپنایا کہ درماں کر دیا
حُسنِ خود افزوں! نگاہِ شوق کی حیرانیاں
یونہی کیا کم تھیں کہ تو نے اور حیراں کر دیا
شوخیوں نے اس طرح چھیڑا کہ حُسنِ یار کو
سر بسر برقِ تبسّم ہائے پنہاں کر دیا
دستِ وحشت کو الجھنا تھا کسی سے، یہ نہ پوچھ
اب گریباں کر دیا اُس کو کہ داماں کر دیا
اُس سکوتِ ناز کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
دل کا گوشہ گوشہ جس نے محشرستاں کر دیا

کون جانے عقدۂ ہستی نگاہِ مست نے
اور مشکل کر دیا یا اور آساں کر دیا
عقل نے صحرا میں کچھ دیکھا نہ ذرّوں کے سوا
اور جنوں نے ذرّے ذرّے کو بیاباں کر دیا
عشق کی رسوائیوں نے غفلتوں نے حسن کی
مجھ کو پنہاں کر دیا تجھ کو نمایاں کر دیا
اہلِ رنگ و بو کچھ اس کا درد بھی تم پر کھلا
جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا
سوزِ پنہاں کا اشارہ تھا کہ اس دل نے فراق
دہر کو دودِ چراغِ شامِ ہجراں کر دیا

صبحِ وطن نگاہ غریب الوطن میں ہے
ہلکی سی اِک جھلک بھی دلِ پُرمحن میں ہے

دوزخ ہو یا بہشت کہاں نور و نارِ عشق
یہ سوز و ساز اور کسی انجمن میں ہے

منصور خوابِ عشق کی تعبیر دیکھنا
کیفِ حیات جلوۂ دار و رسن میں ہے

تیرِ نگاہِ ناز سلامت رہے ترا
ہم کیا کہیں خلش جو دلِ پُرمحن میں ہے

گمراہیوں نے بادِ مخالف سے راہ کی
آوارۂ وطن کوئی راہِ وطن میں ہے

ذکرِ فراق چھیڑنے کی چیز ہی نہ تھی
اِک عالمِ سکوت تری انجمن میں ہے

تجھے ڈھونڈھا جو ہم نے آسمانوں میں زمینوں میں
دہک اُٹھے ہیں کچھ شعلے سے سیّاروں کے سینوں میں
ذرا کر پاسِ ناموسِ ازل، دل توڑنے والے
جھلکتی ہے یہ کس کی آبرو اِن آبگینوں میں
کبھی تیری نگاہیں تھیں کبھی سنتے ہیں تو خود تھا
ہمارے رازدانوں میں ہمارے ہم نشینوں میں
یہ بیداری، یہ تابانی، یہ گردش، یہ نمو کیا ہے
ستاروں میں، گلوں میں، آسمانوں میں، زمینوں میں
کرے کیا کوئی اِس دل کو جو دھوکا جان کر کھائے
وگرنہ حُسن بھی ایسا نہیں ہے اِن حسینوں میں
اسے ایمان کہیئے، کفر کہیئے، یا جنوں کہیئے
طوافِ کعبہ ہے اور بتکدے ہیں آستینوں میں

غنیمت بحرِ ہستی میں ہیں کچھ بیٹھے ہوئے دل بھی
کہ ساحل کے بھی ہیں راز آشنا اِن تہ نشینوں میں

وہ تیور ہیں کہ برقِ طور کے بھی ہوش اڑ جائیں
کہاں کی بجلیاں ہیں ماہ پاروں کی جبینوں میں

خرامِ ناز کی کچھ آہٹوں سے انقلاب آیا
قیامت کروٹیں لینے اُٹھی بیدار سینوں میں

چمن میں جن کی موجِ رنگ و بو طرحِ نشیمن ہو
نہیں معلوم کھلتے ہیں وہ گُل کن سرزمینوں میں

وہ شاید غیر سے لڑکر مرے پاس آئے ہیں ورنہ
جبینِ ناز ڈوبی اور کچھ ہوتی پسینوں میں

فراقؔ ایسوں کی آہِ سرد سے دھوکا نہ کھا غافل
یہی افسردہ دل چنگاریاں بھرتے ہیں سینوں میں

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اُچھلتا رہا زمانے میں
فراقؔ دوڑ گئی رُوح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں
جنوں سے بھُول ہوئی دل پہ چوٹ کھانے میں
فراقؔ دیر ابھی تھی بہار آنے میں
وہ کوئی رنگ ہے جو اُڑ نہ جائے اے گُلِ تر
وہ کوئی بُو ہے جو رسوا نہ ہو زمانے میں
وہ آستیں ہے کوئی جو لہو نہ دے نکلے
وہ کوئی حسن ہے جھجکے جو رنگ لانے میں

یہ گُل کھِلے ہیں کہ چوٹیں جگر کی اُبھری ہیں
نہاں بہار تھی بلبل ترے ترانے میں
بیانِ شمع ہے حاصل یہی ہے جلنے کا
فنا کی کیفیّتیں دیکھ جھلملانے میں
کسی کی حالتِ دل سُن کے اُٹھ گئیں آنکھیں
کہ جان پڑ گئی حسرت بھرے فسانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
ہمیں ہیں گل ہمیں بلبل ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

غفلتِ حُسن اِس انداز سے بیدار ہے آج — بے خبر جتنا ہے اُتنا ہی وہ ہشیار ہے آج
ہر نگہ بے پئے مدہوش کئے دیتی ہے — ہر ادا موجِ مئے ساغرِ سرشار ہے آج
وہ اشاراتِ نہاں کیا دلِ پرشوق کے تھے — حُسنِ محبوب کو اقرار نہ انکار ہے آج
نگہِ لطف و کرم ۔ عذرِ جفا ۔ عرضِ وفا — یہی آسان تھا کل تک یہی دشوار ہے آج
آج مایوس ہے اعجازِ مسیحائی بھی — کسی بیمار کا بچنا بھی تو دشوار ہے آج
کانپ کانپ اُٹھتی ہے رہ رہ کے فضا زنداں کی — کتنی بے ساختہ زنجیر کی جھنکار ہے آج
چال ایسی کہ کہیں نقشِ قدم بھی نہ ملیں — دونوں عالم سے جُدا شوخیِ رفتار ہے آج

اب تو اتنی بھی نہیں شورشِ وحشت کہ فراقؔ
کبھی گھبرا کے کہیں زندگی دشوار ہے آج

سب اہلِ درد ز خود رفتہ سر بسر نکلے
امینِ گنجِ نہاں خبیر معتبر نکلے

حیات اُن کی ہے جو زندگی میں مر نکلے
کرے گا کیا کوئی عاشق جو کام کر نکلے

یہاں سے موت بھی اکثر اداس پلٹی ہے
دیارِ غم کے ہیں یہ، تم یہاں کدھر نکلے

وہ رنگ و نور سراپا وہ موجِ برق تمام
چراغِ راہگذر بن گئے جدھر نکلے

یہ جانتے تھے نہ پوچھے گی وادیٔ غربت
وطن سے یُوں تو نکلنا نہ تھا مگر نکلے

تجھے خبر بھی ہے کیا رنگ ہے نقاب کا آج
کہیں حجاب ہی تیرا نہ پردہ در نکلے

نگاہِ مست کوئی وعدہ کرے، مرا ذمہ
جو تری بات میں کچھ کور یا کسر نکلے

پیامِ شبنم و بادِ سحر سے اہلِ چمن
بہ چہرۂ متبسّم بہ چشمِ تر نکلے

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

ڈرانی[لہ] موت نہیں، موت کا تصوّر ہے
بلا سے موت ہی آئے مگر یہ ڈر نکلے

فراقؔ حشر کے ہنگامے ہو گئے خاموش
بہت طویل فسانے بھی مختصر نکلے

لہ ڈرانی بمعنی بھیانک ڈرانی ڈراؤنی سے زیادہ فصیح ہے

سلسلہ اُس نگہِ مست سے بندھ کر چھوٹا
درد اُٹھا، ہوش اُڑے، ہاتھ سے ساغر چھوٹا

اب وہ شوریدہ سروں کی نہیں شوریدہ سری
آج اُن سے تری دیوانہ چھُٹی، در چھوٹا

تو رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے، لیکن اکثر
سوچتا ہوں میں یہی تجھ سے میں کیونکر چھوٹا

دل کے عقدے وہ کھلیں گے کہ بس اس عارض پر
کہیں بل کھا کے جو گیسوئے معنبر چھوٹا

بے خودی میں نگہِ ناز کی تھی چارہ گری
ہوش آنا تھا کہ بس ہاتھ سے ساغر چھوٹا

اُس کے کھنچنے کا یہ انداز نیا ہے ورنہ
دامنِ یار چھٹا ہاتھوں سے کس اشر چھوٹا

کچھ اُجالا نظر آتا ہے سیہ خانۂ عشق
آج بیمارِ غمِ ہجر سے بستر چھوٹا

زندگی تیرے گنہگاروں کے کیا کام آتی
داغ بھی بستیؔ ناکام کا مٹ کر چھوٹا

میں نے دیکھا ہے فراقِ وطن آوارہ کو
دُور ہر ایک سے، وحشت زدہ دلبر چھوٹا

زمین کانپ اُٹھی آسمان تھرّا آیا — غمِ جہاں کو غمِ عشق نے جب اپنایا
زیادہ ظرف سے دُنیا بھی کوئی دنیا ہے — ہر اک نے تیری محبت کا جام چھلکایا
نگاہِ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی — جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا
نگاہِ ہوش ربا تک تو ہوش قائم ہے — میں کھو گیا ہوں اُن آنکھوں کا جب پتہ پایا
خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ — کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایا
بھٹک رہا ہوں دوراہے پہ قرب و دُوری کے — ابھی کہاں تجھے کھویا، کہاں تجھے پایا
میں سوچتا ہوں یہ دُنیا ہے کیا وہی دُنیا — فسونِ جذبِ محبّت مجھے کہاں لایا
یہ ہجر ہے کہ کوئی یہ وصل وصل کوئی — یہی ہے تیری محبّت اگر تو باز آیا
بتائیں کیا دلِ مضطر اداس کتنا تھا — کہ آج تو نگہِ ناز نے بھی سمجھایا
تری نظر سے بھی جس کو چھپا کے رکھا تھا — وہی تو دردِ محبّت میں آج کام آیا
ترے ہی غم سے سکوں پا گئے سکوں والے — تڑپنے والوں کو تیرے ہی غم نے تڑپایا
نگاہِ شوق نے کچھ انجمن نے کچھ سمجھا — کوئی نہ دیکھ سکا اِس طرح وہ شرمایا
مناسبت بھی ہے کچھ غم سے مجھ کو اے دوست — بہت دنوں سے تجھے مہرباں نہیں پایا
کچھ احتیاطِ غمِ عشق میں بھی لازم ہے — اُداس حسن کو کر کے فراق کیا پایا

اِنسان کو کیا بتائیں وہ آنکھ — کس گوں پہ لگا کے چھوڑتی ہے
سنتے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ زلف — دیوانہ بنا کے چھوڑتی ہے
بیگانہ بھی ہے وہ نرگسِ شوخ — اپنا بھی بنا کے چھوڑتی ہے
بھولے تھے جسے نگاہ تیری — وہ قصہ سنا کے چھوڑتی ہے
جو کچھ بھی کہیں تیری محبت — انسان بنا کے چھوڑتی ہے
غم سے نہیں بچنے دیتی دنیا — یہ زہر پلا کے چھوڑتی ہے
سو طرح بناتی ہے محبّت — سو طرح مٹا کے چھوڑتی ہے
اے دوست امید آج تیرا — دامن شرما کے چھوڑتی ہے

بجلی ہے فراقؔ یاد اس کی
یعنی تڑپا کے چھوڑتی ہے

کیا کعبہ و بُت خانہ کیا مسجد و میخانہ
یہ مستی و ہشیاری افسانہ ہے افسانہ
ہر جادہ و منزل سے مستغنی و بیگانہ
یہ عالمِ ہستی ہے اِک لغزشِ مستانہ
پھر مٹنے مٹانے پر آیا دلِ دیوانہ
انجام سے بے پروا آغاز سے بیگانہ
انکار ہے پھر دل کو زنداں سے نکلنے میں
دیوانے کو کیا کہئے دیوانہ تو دیوانہ
کیا پوچھتے ہو عالم اس رنگِ خموشی کا
جگ بیتی کی جگ بیتی افسانے کا افسانہ

پھر کوچۂ جاناں میں عالم ہے توجّہ کا
پھر چھیڑ پہ مائل ہے وہ نکہتِ مستانہ

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اُسے بیگانہ

سنتے ہیں ازل ہی سے تنگ اہلِ جنوں پر ہے
گلشن ہو کہ صحرا ہو بستی ہو کہ ویرانہ

آئینہ ہے ہر محفل نیرنگِ محبّت کا
عکسِ دلِ سوزاں ہے ہو شمع کہ پروانہ

سائے میں گھٹاؤں کے کیا جام دیا ساقی
میخانۂ ہستی بھی ہے آج اِک افسانہ

پھر چاک گریباں ہے دنیائے سیہ کاری
اِک شعلۂ عریاں ہے پھر جلوۂ جانانہ

سنتے ہیں نہیں ٹوٹا عالم کا جمود اب تک
لے ہم بھی لگاتے ہیں اِک نعرۂ مستانہ

کیا ہوش میں رکھا ہے کیا جوشِ جنوں میں ہے
اے ہمّتِ مردانہ اے جراَتِ رندانہ
کچھ گھٹتی ہی جاتی ہے بیگانگیٔ ساقی
کچھ بڑھتی ہی جاتی ہے کیفیتِ میخانہ
کیا ہوں گی فراقؔ اس کی بیباک نگاہیں بھی
ہے کم نگہی جس کی افسانہ در افسانہ

خیال کو بے اثر نہ جانو، عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نُور ہے کل وُہ نار ہوگا

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

اسے کس بات کا شعور نہیں   چشمِ مخمور اتنی چُور نہیں
جو رگِ جاں سے بھی ہے بڑھ کے قریب   کیوں پتہ ان کا دور دور نہیں
خبر اپنی نہ آج تک آئی   ارے میں اس قدر تو دور نہیں
اتفاقات ہیں زمانے کے   ورنہ کچھ اہلِ غم سے دور نہیں
اہلِ دل کو خراب ہونے دے   تیری آنکھوں سے یہ تو دور نہیں
خستگیِ مہر و ماہ کی مت پوچھ   کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

اے فراقؔ انقلابِ دہر بھی کچھ
وقت کی مصلحت سے دُور نہیں

ہوا کیسے مرے دل پر ترے غم کا اثر اتنا — نہ اتنا ہوش تھا مجھ کو نہ تھا میں بیخبر اتنا

قفس کی تیلیاں لب تشنہ ہیں شعلہ نوائی کی — کوئی بے بال و پر ہوتا نہیں بے بال و پر اتنا

خیالِ جام و مینا! مے پرستو ہوش میں آؤ — ہوا کرتا ہے کوئی میکدے میں بے خبر اتنا

یہ جلوؤں کی فراوانی، یہ عریانی، یہ ارزانی — نہ کر اے عشق اسے شرمندۂ حسنِ نظر اتنا

خموشی بھی ہے اک اندازِ تیرے قصۂ غم کو — زمانہ طول دیتا جائے کر دے مختصر اتنا

نظامِ دہر برہم ہو گیا افلاک ٹکرائے — کوئی شوریدہ سر ہوتا نہیں شوریدہ سر اتنا

فراقؔ آخر کبھی بیتاب بھی ہوتے ہیں فرقت میں
یہ مانا صبر کرتے ہیں محبت میں، مگر اتنا!؟

چھچلے آنسو چھچلی لاگ　　کچا پانی کچی آگ
آگ بھبھوکا گورا مکھڑا　　زلفیں کالے کالے ناگ
حُسن ہے دریا عشق ہے شعلہ　　پانی میں لگ جائے نہ آگ
کھول اے دنیا آنکھیں کھول　　جاگ او نیند کی ماتی جاگ
رُوپ پہ یوں لہلوٹ ہے دُنیا　　جیسے گت پر ناچے ناگ
جادو جادو مدبھری آنکھیں　　شعلہ شعلہ مدبھرے راگ
دریا دریا گریۂ عشق　　صحرا صحرا عشق کی آگ
بولتا ساز ہے جسم کسی کا　　چھڑا ہوا ہے پریم سہاگ
وہ آکاش کی دیوی اُتری　　چندر کرن پر گاتی راگ
تان تان پر پَو پھٹتی ہے　　لو دیتا ہے پریم کا راگ
آج منالے دنیا ہولی　　اپنے لہو سے کھیل لے پھاگ

سونے کو تو عمر پڑی ہے اِک دنیا میں آج ہے جاگ
دنیا کی منزل بدلے مہر و ماہ کی موڑے باگ
انگڑائی لیتی ہے جوانی یا ہے چھلکتی پگھلی آگ
آتے ہی جل اُٹھے چراغ روپ ہے نیر ادیپک راگ
یوں لہراتی ہیں وہ زلفیں جیسے گت چلتا ہو ناگ
حُسن شبنمی پیراہن میں جیسے دبی دبی سی آگ
چنچل چنچل روپ یوں جیسے ادھ کھلی کلیاں ادھ سنے راگ
ڈس نہ لے تجھے کہیں یہ فراق
بھاگ بلائے عشق سے بھاگ

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہونگی

حُسن اور عشق میں پیمانِ وفا ہوتا ہے
ذرّے ذرّے سے تلاطم سا بپا ہوتا ہے

بس مزے تلخیٔ ایّام کے جینے والے
خون پیمانۂ ہستی میں بھرا ہوتا ہے

دردِ دل اُٹھتے ہی تغیّر ہوا رنگِ جہاں
دیکھتے جاؤ کچھ اس سے بھی سوا ہوتا ہے

صبح ہے لرزہ بر اندام کہ وہ جانِ بہار
اُٹھ گیا جام بکف۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے

اُبھر آتی ہیں جسے سنتے ہی چوٹیں دل کی
درد وہ نغمۂ بلبل میں بھرا ہوتا ہے

منزلیں درد کی کاٹی ہیں جسے لیکے فراقؔ
آج وہ تیر کلیجے سے جدا ہوتا ہے

تم تو چپ رہنے کو بھی رنجشِ بے جا سمجھے
درد کو درد نہ سمجھے تو کوئی کیا سمجھے

جب تری یاد نہ تھی جب ترا احساس نہ تھا
ہم تو اُس کو بھی محبت کا زمانہ سمجھے

تیرے وارفتۂ وحشت کی ہے دنیا ہی کچھ اور
وہ گلستاں، نہ وہ زنداں نہ وہ صحرا سمجھے

یاس و اُمید کسی کا بھی سہارا نہ رہا
اب تو جو سمجھے عنایت تری جیسا سمجھے

زندگی یوں کہیں برباد ہوا کرتی ہے
وہ ترا غم تھا جسے ہم غمِ دنیا سمجھے

کہہ گئی کیا نگہ ناز تری ہم جس کو
بات کی بات فسانے کا فسانا سمجھے

عشق کے سوزِ نہاں کی وہ جھلک تھی لیکن
نہ بُرا سمجھے ہم ایسوں کو نہ اچھا سمجھے

بے نیازی کو بہت سہل سمجھ رکھا تھا
عشق لے آج ترا حُسنِ خود آرا سمجھے

بے بجھی آگ تھی یا شعلۂ مے کی تھی لپک
جس کو اِک جلوۂ سرِ ساغر و مینا سمجھے

ایسے دیوانے کا دنیا میں ٹھکانا ہے کہیں
لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

نگہِ لطف و کرم نے نہ کہیں کا رکھا
جس کا یہ حال ہوا وہ تجھے کیسا سمجھے

آہ اُن مست نگاہوں کے اشارے بھی فراقؔ
ہم سمجھنے کو بہت سمجھے، مگر کیا سمجھے

ہر جنبشِ برق سے عیاں اقرار بھی ہے انکار بھی ہے
یہ نرگسِ رعنا اے ساقی سرشار بھی ہے ہشیار بھی ہے

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرتِ صحرا بھی ہے اور کچھ رنجِ در و دیوار بھی ہے

یہ جام ہے آبِ حیات مگر کچھ بوئے عدم بھی آتی ہے
یہ عشق حیاتِ خضر بھی ہے یہ عشق فنا آثار بھی ہے

اُمید نہ دے پرسش بھی کر دے اور فریبِ حسن کوئی
مایوسوں کا خوش ہو جانا آساں بھی ہے دشوار بھی ہے

کچھ کیفِ شبانہ بھی آنکھوں میں کچھ آئی ہوئی انگڑائی بھی

تصویرِ سحر نیرنگِ سحر یہ ہوش بھی ہے یہ خمار بھی ہے

دن رات شگوفے کھلتے ہیں دن رات بہاریں لٹتی ہیں

تدبیرِ جنوں، تقدیرِ چمن ایام کی کچھ رفتار بھی ہے

اِک نازِ نگاہ کی جنبش سے نشہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا

وہ آنکھ جو مائلِ صلح بھی ہے آمادۂ صد پیکار بھی ہے

رہ رہ کے خلش بھی ہوتی ہے کچھ کشمکشِ دل بھی کم ہے

سنتے ہیں فراقؔ وہ تیرِ نظر دل میں بھی ہے دل کے پار بھی ہے

بیخودی میں اِک خلش سی بھی نہ ہو ایسا نہیں
تو نہ آئے یاد لیکن میں تجھے بھولا نہیں

پاپ اور پُن، رنج و راحت، وصل و فرقت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

عشق میں غافل وہ رنگا رنگِ کیفیت نہ ڈھونڈھ
درد کا اُٹھنا نگاہِ ناز کا اُٹھنا نہیں

ایسی بھی کیا احتیاطیں اے نگاہِ شوخِ یار
گدگدا نا مُسکرانا تیرے بس میں کیا نہیں

دل ہو یا آنکھیں ہوں کیفِ غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اس بزم میں چھلکا نہیں

حُسن کی بیگانگی پر غم کی گویا حد نہیں
دل میں لیکن سوچیے تو عشق خود اپنا نہیں

کیا خبر ہم کو وہ چشمِ آشنا کیوں پھر گئی
بیخودی غم کی حریفِ رنجشِ بیجا نہیں

آج تو حسن و محبّت ہو گئے تھے مل کے ایک
تُو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

اِک جہاں لاکھوں فسانے عشق تصویرِ سکوت
درمیاں رُسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

یوں بھی آتی ہے قیامت اے خرامِ نازِ یار
مٹ کے بھی دنیا محبّت کی تہ و بالا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب
عشق کا رونا ہے یہ تقدیر کا رونا نہیں

ہیں فریبِ احساسِ پنہاں کے سکون و اضطراب
عشق ہے وہ درد جو گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں

اِک اُداسی ہے نگاہِ ناز پر چھائی ہوئی
یہ پیامِ زندگی شاید کوئی سُنتا نہیں

حُسن سر تا پا تمنا عشق سر تا پا غرور
اِس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

اے نگاہِ بے محابا تو نے یہ کیا کر دیا
آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثارِ محبت جان دیدینا نہیں

ہاں اُٹھا آنکھیں کہ ہو کچھ پردہ داری عشق کی
اتنی رسوا تے جہاں یہ نرگسِ رُسوا نہیں

زندگیٔ عشق میں بھی انقلاب آ ہی گیا
آج اِس کو دیکھ کر دل کا سکوں دیکھا نہیں

لے اُڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

ایک حالت پر زمانے میں نہ گذری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دنیا نہیں

دل یہ کہتا ہے ٹھہرنا عشق میں دشوار ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچھا نہیں

عشق جو چاہے کہے تیرے نہ سننے کو مگر
دل کو جو کہنا ہے وہ کچھ راز بھی ایسا نہیں

سرحدِ جذب و اثر سے حسنِ جاناں دور ہے
دل کی دنیا بھی محبت کی مگر دنیا نہیں

غور کر اس کیفیت پر کچھ سمجھ یہ سوز و ساز
عشق میں دل درد کو ملتا ہے دل دکھتا نہیں

جلوۂ دار و رسن آئینۂ زنگِ سکوت
لب کشائی کو حقیقت کا کچھ اندازہ نہیں

جس کے شعلوں سے تھی کل تک گرمئ بزمِ حیات
آج اس خاکسترِ دل سے دھواں اٹھتا نہیں

تفرقوں سے پاک ہیں آنسو محبت کے فراق
حسن سر تا پا تغافل دوست و دشمن کا نہیں

اے فراق اب اور ہی لے سے ترانہ چھیڑیئے
اصغر دفانی کی دنیا آج کی دنیا نہیں

اس نگاہِ لطف کو بھی بدگماں پائیں گے کیا
دل نوازی سے بھی اُس کی آج شرمائینگے کیا

یہ اُمیدیں عشق کی یہ عہد و پیماں حُسن کے
دل سے آتی ہے صدا لیکن وہ اب آئینگے کیا

بندھ کے جیسے اِک گھٹا آہستہ آہستہ کھُلے
رفتہ رفتہ غم کے سب آثار مٹ جائینگے کیا

یہ نہیں ہوتی تھی حالت جانب در دیکھ کر
آستانِ یار سے ہم آج اُٹھ جائینگے کیا

ہر نظر اُس کی ہے پیغامِ حیاتِ جاوداں
اہلِ دل اک عمر کے احساں گنوائیں گے کیا

حُسن بے پایاں سہی اِس درجہ کیوں مایوس ہوں
عشق اِک زنداں سہی اتنا بھی گھبرائیں گے کیا

اور کر دیں گے مآلِ عشق کا ردِّ عمل
جب پشیمانی بھی دھوکا ہے تو پچھتائیں گے کیا

بڑھ رہی ہے ہر طرف اِک کیف آور تیرگی
دوشِ ہستی پر بھی وہ گیسو بکھر جائیں گے کیا

یہ تبسّم، یہ تکلّم یہ اشاراتِ نہاں
ہم نگاہِ ناز کی باتوں میں آجائیں گے کیا

عشق کی باتیں سمجھنے کی نہ سمجھانے کی ہیں
سب بجا شرحِ دبیاں ہم اُن کو سمجھائینگے کیا

انگلیاں اُٹھیں۔ زمانے کی نگاہیں بھی اُٹھیں
دیکھنے والے تری آنکھوں کے شرمائیں گے کیا

اپنی تسلیم و رضا پر شرم سی آنے لگی
ہم نیازِ عشق کی حد سے بھی بڑھ جائینگے کیا

دل کی ہیں آبادیاں گمراہیاں ہیں عشق کی
اس جگہ بھی دربدر کی ٹھوکریں کھائیں گے کیا
بار سا ہے اہلِ دنیا پر نشاطِ زندگی
جب خوشی اُن سے نہیں اُٹھتی تو غم کھائینگے کیا
سنتے آئے ہیں حسابِ دوستاں دَر دلِ فراقؔ
کاروبارِ عشق میں کھوئیں گے کیا، پائیں گے کیا

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا، زمانہ تھا گذر گیا

فسردہ کیوں ہیں چار بوند آنسوؤں میں کیا نہیں
شرارتیں نئی نئی، طرادتیں نئی نئی

جہاں میں وحشت و ہوش اہلِ دل کو یکساں ہے
تمام وحشتِ جنوں ہے تمام زنداں ہے

تمام سوز و خلش ہے جہانِ نکہت و رنگ
یہ خار زار سراسر ہے یا گلستاں ہے

نہ جانے کون صدا آ رہی ہے کانوں میں
سنا ہے مذہبِ دل کفر ہے نہ ایماں ہے

ترے خرام سے یہ رازِ قرب و بُعد کھلا
نہ ہاتھ آئے جو ہاتھ آ گے بھی وہ داماں ہے

صدائے ساز صدائے شکستِ ساز بھی ہے
وفا جو ہوتے ہی ٹوٹے وہی تو پیماں ہے

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی
جو چل پڑے تو بیاباں رُکے تو زنداں ہے

گلے کا ہار ہیں بحرِ حیات کی موجیں
جو چاک ہو نہ سکے بس وہی گریباں ہے
کھلیں گے رازِ جہاں مشتِ خاک آدم سے
اسی غبار میں اک کارواں بھی پنہاں ہے
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی
رگِ جنوں ہے رگِ گل ہے یا رگِ جاں ہے
فراقؔ سعیِ محبت کی شرح کیا کیجئے
بس ایک کام ہے۔ دشوار ہے نہ آساں ہے

کرو غمِ گذشتہ کو شریکِ غمِ امروز
خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

یہ بزمِ عام بھی اے دوست! بزمِ عام نہیں
نگاہیں اُٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

دُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی　　وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ　　مسافروں سے کہو اُس کی رہ گزر آئی
ترا ہی رنگ سرشکِ غمِ جہاں میں بھی تھا　　نگاہ میں تری تصویر سی اُتر آئی
فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن　　پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی
نیا نہیں ہے مجھے مرگِ ناگہاں کا پیام　　کہ جیتے جی مجھے اکثر مری خبر آئی
کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا　　کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کہیں نشانِ سکوں بھی ہے فرش سے تا عرش　　مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی
غم و نشاط کی دیوی پھر ایک عمر کے بعد　　بہ چہرۂ متبسم بہ چشمِ تر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست　　ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شبِ فراق اُٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

یوں نئی زندگی نظر آئی
وقت کے دل کی چوٹ اُبھر آئی

حُسنِ قاتل کا ہے کہاں تک اثر
موت کی شکل بھی نکھر آئی

اِس طرح آج کوئی یاد آیا
جیسے اپنی مجھے خبر آئی

عاشقوں کو خوشی سے کیا لیکن
یہ بلا بھی اُنہیں کے سر آئی

اے خدوخالِ زیست میری نگاہ
اِن خطوں میں بھی رنگ بھر آئی

زندگی میری مجھ کو مار چکی
اے مری موت تو کدھر آئی

ذرے ذرے میں بارہا اے دوست
تیری تصویر سی اُتر آئی

میں نے توڑا دم اِس طرح کہ فراق
موت کو زندگی نظر آئی

ماتھے پہ ترے صبحِ چمن کھیل رہی ہے
آنکھوں میں محبّت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بَل کھاتی ہے پیہم۔ کہ ہوا سے
وہ زُلفِ شکن زیرِ شکن کھیل رہی ہے
پیراہنِ خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اُس پیکرِ رنگیں میں زہے شوخئ پنہاں
بجلی تہِ دامانِ چمن کھیل رہی ہے
اِن مدبھری آنکھوں میں چمک جاتی ہیں راتیں
یا مستئ صہبائے کہن کھیل رہی ہے
کیا طُور کی چوٹی پہ ہے لرزاں خطِ زرّیں
بل کھائی جبیں پر جو شکن کھیل رہی ہے

سنگم پہ نہانے میں وہ بل کھاتا ہوا جسم
اک موجِ سرِ گنگ و جمن کھیل رہی ہے

وہ مہکی ہوئی چھاؤں نگاہوں کی دلوں پر
غنچوں سے ستاروں کی کرن کھیل رہی ہے

لو دیتا ہے کیا کیا یہ چراغ تہ داماں
ملبوس سے رنگینیٔ تن کھیل رہی ہے

لہراتے ہوئے جسم پہ اک چھینٹ سی پڑتا
موجوں سے کوئی چندر کرن کھیل رہی ہے

اِنسانیت آفاق بدلنے کو قضا سے
آج اوڑھے ہوئے سرخ کفن کھیل رہی ہے

باتوں سے فراقؔ اُس کی معطر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

صباحتِ رُخِ رنگیں بہارِ صبحِ وطن
کھلا ہوا ہے تری مسکراہٹوں کا چمن

سرکتی جاتی ہیں ماتھے سے گیسوؤں کی لٹیں
طلوعِ ماہِ مبیں ہے کہ چھٹ رہا ہے گہن

یہ نرم نرم ہوائیں یہ چھاؤں تاروں کی
ہے آج دیکھنے کی چیز رات کا جوبن

یہ کاروانِ زمانہ چلے ہی جاتا ہے
نہ خوفِ شامِ غریباں نہ فکرِ صبحِ وطن

بہار لٹتی تھی مٹھی میں کل گلستاں تھا
میں غنچے غنچے میں کرتا رہا ہوں سیرِ چمن

نگاہیں پڑتی ہیں تجھ پر، خوشا یہ صبحِ بہار
کرن کی تیلیوں سے چھن رہا ہے حُسنِ چمن

جدھر نگاہ اُٹھی سیرِ شبنمستاں ہے
فراقؔ حسنِ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن

کچھ نہ کچھ عشق کی تاثیر کا اقرار تو ہے / اُس کو الزامِ تغافل پہ کچھ انکار تو ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے مشتاقِ جمال / اُنہیں دیدار نہ ہو حسرتِ دیدار تو ہے

معرکے سر ہوں اسی برقِ نظر سے اے حُسن / یہ چمکتی ہوئی چلتی ہوئی تلوار تو ہے

عشق کا شکوۂ بے جا بھی نہ بیکار گیا / نہ سہی جور مگر جور کا اقرار تو ہے

تجھ سے ہمت تو پڑی عشق کو کچھ کہنے کی / خیر شکوہ نہ سہی شکر کا اظہار تو ہے

اِس میں بھی رابطۂ خاص کی ملتی ہے جھلک / خیر اقرارِ محبت نہ ہو انکار تو ہے

کیوں جھپک جاتی ہے رہ رہ کے تری برقِ نگاہ / یہ جھجک کس لئے اِک کشتۂ دیدار تو ہے

کئی عنوان ہیں ممنونِ کرم کرنے کے / عشق میں کچھ نہ سہی زندگی بیکار تو ہے

چونک اُٹھتے ہیں فراقؔ آتے ہی اُس شوخ کا نام
کچھ سراسیمگیٔ عشق کا اقرار تو ہے

طور تھا، کعبہ تھا، دل تھا، جلوہ زارِ یار تھا عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالمِ اسرار تھا

نشۂ صد جام کیفِ انتظارِ یار تھا ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغرِ سرشار تھا

دل دُکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

الوداع اے بزمِ انجم ہجر کی شب الفراق تا بہ دَورِ زندگانی انتظارِ یار تھا

ذرّہ ذرّہ آئینہ تھا خود نمائی کا فراق

سربسر صحرائے عالم جلوہ زارِ یار تھا

چُپ ہو گئے ترے رونے والے دُنیا کا خیال آگیا ہے

غمِ حیات وہی، دورِ کائنات وہی جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے؟

نہ رہی وہ بزم نہ اب وہ جلوۂ جامِ مردفگن رہا
نہ رہے وہ مست نہ کوئی اہلِ نگاہِ توبہ شکن رہا

نہ وہ رنگ نرگسِ آشنا نہ وہ دوستی کا چلن رہا
رہیں حسن کی وہی شوخیاں وہی دورِ چرخِ کہن رہا

جو قدم اُٹھے بھی تو کیا اُٹھے کسی گمشدہ کا سوئے وطن
نہ وہ ہم سفر نہ وہ منزلیں نہ وہ جذبِ اہلِ وطن رہا

وہ ادائے شوخیٔ حسن تھی یہ شعارِ فطرتِ عشق تھا
نہ ملالِ شکوۂ ناروا نہ خیالِ رنج و محن رہا

سرِ راہِ منزلِ عاشقی بڑھے کاروانِ عدم کہ اب
نہ کشاکشِ غمِ زندگی نہ وبالِ جامۂ تن رہا

ترے بیقراروں نے اک نظر سے نظامِ دہر بدل دیا
نہ رہیں زمیں کی وہ گردشیں نہ وہ دورِ چرخِ کہن رہا

نہ وہ اگلے وقتوں کی بیخودی نہ وہ اگلے وقتوں کی غفلتیں
نہ وہ خوابِ عہدِ کہن رہے نہ فراقِ عہدِ کہن رہا

تنگ ہے مجھ پہ ہر جگہ وسعتِ کائنات میں
تُو نے وہ درد اُٹھا دیا پردۂ التفات میں
کیفِ فنا بھی آ چلا تیرگیٔ حیات میں
ہونے لگی ہیں لرزشیں موجِ تجلیات میں
سرحدِ صبح و شام سے دُور جمالِ یار ہے
کہتے ہیں جس کو وقتِ دید دن ہی وہ ہے نہ رات ہیں
ایک نگاہِ ناز میں جذبِ ہزار اضطراب!
عشق کی سو کہانیاں حُسن کی ایک بات میں
عالمِ بیدلی درست، شکوۂ بےکسی بجا
حُسن کو دخل بھی تو ہو عشق کے واردات میں

آہ یہ پُرسشِ کرم اور یہ ادائے بے حسی
اُف یہ ستم طرازیاں شوخیٔ التفات میں

کوئی نہیں ہے رازداں کوئی نہیں ہے دردرس
عالمِ سوز و ساز میں، غمکدۂ حیات میں

سوز نہیں تپش نہیں، کیف نہیں اثر نہیں
یہ بھی ہے دن میں دن کوئی رات ہے، یہ بھی رات میں

گھٹتی چلی ہیں دوریاں بڑھتی چلی ہیں نسبتیں
برقِ نگاہِ یار میں، ہستیٔ بے ثبات میں

پوچھ نہ عشق کی نگاہ کیسے پڑی کہاں پڑی
عقل اُلجھ کے رہ گئی دامِ تعینات میں

ہاں وہی نو بہارِ ناز ہاں وہی سب سے بے نیاز
سوز بھی ہے حیات میں، ساز بھی ہے ممات میں

برقِ تبسمِ نہاں کوندتے کوندتے رُکی
درد سا اُٹھ کے رہ گیا سینۂ کائنات میں

لطف و ستم، وفا جفا، یاس و اُمید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں
خاطرِ حسن سے فراقؔ گشتۂ امتیاز ہوں
ورنہ جفا میں بھی ہے کیا جو نہیں التفات میں
شکوۂ بے توجہی اب تو تجھے نہیں فراقؔ
لُوکتی ہے نگاہِ ناز آج تو بات بات میں

شبنم کی نرمیاں جوانی تیری
شب کی سرشاریاں جوانی تیری
موتی تاروں کے پڑ چلے ہیں ٹھنڈے
چٹکاتی ہے اُنگلیاں جوانی تیری

چھلک کے کم نہ ہوا ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی زمانے کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

کچل کے سر جو اٹھائیں حریف فکر نہ کر
کب اُڑتی خاک سواروں کی ہمرکاب نہیں

شکستِ رنگِ رخِ روزگار دیکھ فراق
وہ مہر و ماہ کے چہروں پہ آب و تاب نہیں

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا
ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

دیکھنے کے بھی کچھ انداز ہیں اے اہلِ نظر
یہ نگاہیں بھی نہیں محرمِ اسرار ابھی

حال و مستقبلِ دُنیا کا کہاں ہند میں ذکر
عہدِ ماضی کا یہاں گرم ہے بازار ابھی

منزلِ دوست کہاں تک میں پھروں آوارہ
نظر آتے تھے ترے کچھ در و دیوار ابھی

ہاں تری شانِ تغافل میں کمی ہونے نہ پائے
اور ہونا ہے تری آنکھوں کو ہشیار ابھی

آج تک آنکھ ستاروں کی لگی ہے لیکن
عشقِ کا دَور ہوا ہی نہیں بیدار ابھی

کوئی چھیڑے تو کسی انداز سے اِسکو چھیڑے
نرگسِ ناز تری مست ابھی ہشیار ابھی

اے شبِ تارِ غمِ دوست تری عمر دراز
کہ زمانے میں نہیں صبح کے آثار ابھی

جن کو بس میں کرے یہ نہیں آسان ہنوز
اِس قدر عشق نہیں سادہ و پُرکار ابھی

تم بڑھاؤ نہ مجھ سے پیار بہت ــــ یاد آؤ گے بار بار بہت

لے اُڑی وحشتِ حیات مجھے ــــ کی زمانے نے گیر و دار بہت

تیری برقِ نظر سے کیا نسبت ــــ ہم نے دیکھے ہیں بیقرار بہت

ہم بھی آخر کو صبر کر بیٹھے ــــ کر چکے تیرا انتظار بہت

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں ــــ بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

درد۔ غم۔ رنج۔ اُمید۔ نومیدی ــــ عشق میں بھی ہیں کاروبار بہت

آگیا صبر بس اب اے غمِ عشق ــــ کر چکا تو کشودِ کار بہت

کتنے کھوئے ہوئے ہیں اہلِ چمن ــــ تیز ہے بادۂ بہار بہت

آہ جب عشقِ بدگماں کو فراق
تھے فریبِ نگاہِ یار بہت !

لطف کے اب نہ مزے ہیں نہ شکایت کے مزے
بیکسی عشق کی ہے اور تری غفلت کے مزے

موجِ مے، نغمۂ نے، نکہتِ گُل، کیفِ شباب
سب ہیں ہیں اُٹھتے ہوئے دردِ محبّت کے مزے

ہم نے جی بھر کے کئی طرح سے دیکھا ہے مگر
ہائے رے ہائے ترے دردِ محبّت کے مزے

سچ ہو یا جھوٹ لبِ یار کے اعجاز تو دیکھ
بھر دیے وعدۂ فردا میں قیامت کے مزے

تیری بیباک نظر کے وہ اشاراتِ نہاں
آ گئے انجمنِ ناز میں خلوت کے مزے

یہ سیہ کاریٔ عشق اور یہ معصومیٔ حُسن
انہیں پردوں میں ہیں اسرارِ حقیقت کے مزے

تجھ کو سو جان سے اے دوست جنہوں نے چاہا
پوچھ لے اُن سے نہ نکلی ہوئی حسرت کے مزے

اور کیا تیرے گنہگار محبت پاتے
پا گئے تجھ سے خدا ہو کے ندامت کے مزے

تلخ کامانِ محبت وہ اُٹھی چشم کرم
ہاں ذرا شکر کے پردے میں شکایت کے مزے

ایک ہی ساتھ ملے تیرے تلوّن کے نثار
تری حسرت کے عداوت کے محبت کے مزے

یاد ہیں چھلکے ہوئے جام کے دور آتے ہی
نگہِ مست کی بدلی ہوئی نیت کے مزے

دل نہ مصروف نہ مایوس نہ محروم فراق
وصل ہے اب نہ امیدیں ہیں نہ فرقت کے مزے

اِس ادا کو جو نظر والے ہیں کیا کہتے ہیں
نہ وفا کہتے ہیں جس کو نہ جفا کہتے ہیں

لوگ کیا جانئے کیوں مجھ کو بُرا کہتے ہیں
آپ کہتے ہیں جو ایسا تو بجا کہتے ہیں

شکوۂ ہجر کریں بھی تو کریں کس منہ سے
ہم تو اپنے کو بھی اپنے سے جدا کہتے ہیں

بزمِ آفاق کو خلوت جو بنا دیتی ہے
اُسی سنّاٹے کو ہم تیری صدا کہتے ہیں

تیری روداد تم باتوں ہی باتوں میں ہم آج
فائدہ کیا ہے مگر یونہیں ذرا کہتے ہیں

شادمانی کے بھرم اہلِ محبت پہ کھلے
اِسی احساس کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

منزلیں کاٹتی ہے دُور کی تاروں بھری رات
کس لئے لوگ اسے آبلہ پا کہتے ہیں

باتوں باتوں میں کہیں وہ جو پتے کی کہہ دے
عشق کو محرمِ بیگانہ نما کہتے ہیں

گونج اٹھتی ہے ہر اک شعر میں تیری آواز
یعنی جو کہتے ہیں تیرا ہی کہا کہتے ہیں

تیری آنکھوں نے سُنی بات سُنا دی، لیکن
اِسی مضمون کو ہم لوگ نیا کہتے ہیں

اور دل کے کام و دہن جو بھی کہیں ہم تو فراقؔ
تلخیٔ زیست کو جینے کا مزا کہتے ہیں

عشق فسردہ ہی رہا غم نے جلا دیا تو کیا
سوزِ جگر بڑھا تو کیا دل سے دُھواں اٹھا تو کیا
پھر بھی حیاتِ عشق میں حسن کی وہ کسک کہاں
ہر دلِ بیقرار میں درد دبا دیا تو کیا
پھر بھی تو شبنمی ہے آنکھ پھر بھی تو ہونٹ خشک ہیں
زخمِ جگر ہنسا تو کیا غنچۂ دل کھلا تو کیا
پھر بھی تو اہلِ غم ترے رازِ سکوں نہ پا سکے
تو نے نظر کی لوریاں دے کے سلا دیا تو کیا
پھر بھی مری صدائے درد تیرے لئے سکوت ہے
ہل گیا آسماں تو کیا کانپ اُٹھی فضا تو کیا
عشق کی غفلتیں نثار چھیڑ نہ اے خیالِ یار
تو نے جگا دیا تو کیا غم نے اُٹھا دیا تو کیا

کون سا فرق آگیا گردشِ روزگار میں
عشق تڑپ اُٹھا تو کیا اشک ٹپک پڑا تو کیا

صبر طلسم در طلسم ضبط فریب در فریب
اشک بھی تھم گیا تو کیا دل بھی سنبھل گیا تو کیا

اور اُلجھ کے رہ گیا قصۂ حیات و موت کا
زیست کے راز کھولتی بحثِ فنا بقا تو کیا

منزلِ بے خودیٔ عشق موت کو بھی نہ مل سکی
جائے گی اتنی دُور تک عمرِ گریز پا تو کیا

دیکھ فضائیں جاگ اُٹھیں زندگی جگمگا اُٹھی
سازِ جنونِ عاشقی چھڑتے ہی سو گیا تو کیا

موجِ فنا کو کشتیاں چیر گئیں، کہ دیکھتی
بحر کی بیکرانیاں غفلتِ ناخدا تو کیا

عمرِ دوام مل گئی عالمِ سوز و ساز کو
مجھ کو مٹا دیا تو کیا دل کو بجھا دیا تو کیا

عذرِ ستم کی جان تھی رنجشِ بے سبب تری
جھک بھی گئی نظر تو کیا آ بھی گئی حیا تو کیا

اب تو تری صدا بھی ہے میری صدائے بازگشت
آج سوالِ عشق پر آئی بھی اک ندا تو کیا

اور اداس کر دیا رنگِ سکوتِ ناز نے
وجہِ ملال پوچھتی نرگسِ آشنا تو کیا

دیکھنے والے کو ترے حسرتِ دید رہ گئی
پردہ سا اُٹھ گیا تو کیا سامنا ہو گیا تو کیا

تھیں مری بے قراریاں محرمِ عشوہ نہاں
ہوش نہ تھے بجا تو کیا دل نہ ٹھکانے تھا تو کیا

وہ تو کسی کا بامِ ناز راہِ جنوں سے مل گیا
کاٹی یہ چڑھائیاں عقلِ شکستہ پا تو کیا

دیکھ رہا ہوں اور کچھ حسنِ کرشمہ ساز میں
ناز تو کیا ادا تو کیا عشوہ تو کیا حیا تو کیا

سُودہ زیاں کے لفظ بھی وہم و گماں ہیں سربسر
حُسن بھی پا سکا تو کیا عشق بھی کھو سکا تو کیا

اپنی نگاہ کے فریب رازِ نشاطِ عشق ہیں
دیدۂ شوق بھی ترے حُسن کو دیکھتا تو کیا

غربت و گمرہی کا نام کوچۂ یار رکھ دیا
گو تھیں تمام منزلیں عشق کے زیرِ پا تو کیا

کوئی مزاج داں نہ تھا گردشِ روزگار کا
حُسن تھا شادماں تو کیا عشق اداس تھا تو کیا

پھر بھی تری نگاہ یاد آ ہی گئی فراق کو
بارِ نیاز و نازِ عشق حُسن سے اُٹھ سکا تو کیا

جہاں بھی جستجوئے یار میں ٹھہر جاتے
یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

کچھ کر لیا نتیجۂ تدبیر دیکھ کر
کر لیں گے کچھ نوشتۂ تقدیر دیکھ کر

ہوتے ہیں بدحواس مگر اس قدر کہاں
مَیں کھو کے رہ گیا تری تصویر دیکھ کر

اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں
دل بڑھ گیا ہے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

اے دردِ نزع چھوڑ امیدِ فریبِ دید
دیکھیں گے خواب کی تعبیر دیکھ کر

عالم وہ ہے فراق کہ دن ہے نہ رات ہے
کرتا ہے کوئی نالۂ شبگیر دیکھ کر

خون آلودہ یہ رنگینیٔ تحریر رہے　　موج بادہ میں بھی شانِ خطِ تقدیر رہے

انجمن بادہ پرستوں کی بھی دلگیر رہے　　زندگی کٹتی ہوئی رات کی تصویر رہے

بے نیازی نے تری دل کو کیا گرویدہ　　عشق اب اس لئے منت کشِ تاثیر رہے

ہائے وہ پاؤں جو ٹوٹے سرِ منزل آ کر　　ہائے وہ ہاتھ جو آگے ترے دلگیر رہے

یہ کرامت تو اسی چشمِ فسوں ساز میں ہے　　کہ خموشی میں نہاں شوخیٔ تقریر رہے

اب سکوں بھی ہے مرا خاطرِ عالم پہ گراں　　اور کس طرح کوئی درد کی تصویر رہے

آہ! ایسوں کے بھی جینے کے ہیں کیا کیا پہلو　　جن سے اے دوست! ترا درد بغلگیر رہے

اے فراقؔ اب تو شبِ ہجر میں اتنا بھی کیا

کہ نہ آئے وہ تو کچھ باعثِ تاخیر رہے

فردائے حشر خیز کی تصویر ہو گئی — دنیا خود اپنے خواب کی تعبیر ہو گئی

کس بل تھا جب قضا و قدر اسکے بس میں تھے — تدبیر ڈھیلی پڑ گئی، تقدیر ہو گئی

جب جب کھلا ہے رازِ نشاطِ جمالِ دوست — دنیا کسی کے درد کی تصویر ہو گئی

دنیا تھی رہگذر تو قدم مارنا تھا سہل — منزل ہوئی تو پاؤں کی زنجیر ہو گئی

ناکامیوں کی سوزشِ پنہاں نہ پوچھئے — عاشق کی خاک سنتے ہیں اکسیر ہو گئی

اس مستِ ناز پر پھٹی پڑتی ہے زندگی — ایک ایک سانس موت کی تسخیر ہو گئی

کھلتا نہیں کہ جذبِ نہاں سے کسی کی یاد — دلگیر ہو گئی کہ بغلگیر ہو گئی

اے دوست تیرے خط سے کرامات ہو گئی — تحریرِ حسن بول اٹھی، تقریر ہو گئی

ہر کام عشق کا اسی کارن اٹک گیا — تعجیلِ شوق باعثِ تاخیر ہو گئی

اے اہلِ غم ابھی تو یہ دنیا جوان ہے — دنیا تھی وہ خیال کی جو پیر ہو گئی

تیری نگاہِ ناز ہے یا بج رہے ہیں کان — شوخی نظر کی شوخیِ تقریر ہو گئی

جس دم نظامِ غم کے عناصر میں آگیا — دنیا نشاطِ عشق کی تعمیر ہو گئی

بیدردو اتنی کب تھی طبیعت فراق کی
تجھ سے کھنچی کچھ ایسی کہ شمشیر ہو گئی

حیراں ہوئے تھے جو تصور میں بھی کبھی　　　تصویر ہو گئے تری تصویر دیکھ کر

اے دردِ نزع چھوڑ امیدِ فریبِ دید　　　دیکھیں گے خواب خواب کی تعبیر دیکھ کر

اہلِ جنوں کو وسعتوں کی اب کمی نہیں　　　دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

خوابِ عدم سے جاگتے ہی جی پہ بن گئی　　　زہرابۂ حیات کی تاثیر دیکھ کر

یہ عہد باندھ کر نگہِ مست جھک گئی　　　اٹھیں گے اک جہان کو تسخیر دیکھ کر

اصلاح اور بات بگاڑے تو کیا کریں　　　بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھ کر

چونک اٹھی عمرِ خضر بھی دردِ حیات سے　　　آبِ بقا میں زہر کی تاثیر دیکھ کر

ہوتے ہیں بدحواس مگر اس قدر نہیں　　　میں کھو کے رہ گیا تری تصویر دیکھ کر

سب مرحلے حیات کے طے کر کے اب فراق
بیٹھا ہوا ہوں موت میں تاخیر دیکھ کر

کیا فغاں کیا اشکِ غم کیا نالہ مجھ ناشاد کا
تم نہ جبتک دل دُکھاؤ لطف کیا فریاد کا

جینے والے جی رہے ہیں شاد کیا ناشاد کیا
چھیڑنا اچھا نہیں اے دوست اِس رُوداد کا

ہم کو مٹنا ہے تو پھر تجھ کو نمایاں کرچلیں
یوں بھی کیا برباد ہونا ہستیٔ برباد کا

اے نگاہِ لطف۔ اِس مشقِ تغافل کے نثار
شاد ہو جانا بھی ممکن ہے کسی ناشاد کا

داستاں در داستاں ہے ماجرائے حسنِ یار
کیفیت در کیفیت چھڑنا ہے اِس رُوداد کا

راز اندر راز بیبا کانہ جلوے حُسن کے
کشف اندر کشف ہر عالم دلِ ناشاد کا

اِک سکوتِ نازصد ہنگامہ در ہنگامہ اور
خامشی در خامشی پردہ مری فریاد کا

قصۂ دل جس کو کل تم سنتے سنتے سو گئے
ہجر اِک پُر درد ٹکڑا تھا اِسی رُوداد کا

ایک ہنگامہ تو برپا ہے فراقؔ اب کیا ضرور
سننے والا بھی ہو کوئی نالہ و فریاد کا

مانا کہ نگاہ بھی قاتل تھی مانا کہ اُٹھی بھی تیری طرف
ہاں ہم نے تو یہ بھی جان لیا کچھ اس میں تری تقصیر نہیں

جو پڑاؤ تھا کبھی اہلِ غم کا خموش اب وہ دیار ہے
نہ جرس کی اب وہ صدائیں ہیں نہ وہ کارواں کا غبار ہے

نہ فنا سے عشق ہے بیخبر نہ وجودِ دوش پہ بار ہے
کبھی آنکھ موت کی آنکھ میں کبھی زندگی سے دوچار ہے

یہ بھری بہار میں کیا ہوا؟ نہ وہ شوخیاں نہ وہ گرمیاں
نہ گلوں میں اب وہ نکھار ہے نہ جوانیوں میں اُبھار ہے

نہ کھُلا کہ بیٹھے بٹھائے چھا گئیں کیوں دلوں پہ اداسیاں
وہی رونقیں سرِ بزم ہیں وہی حُسن روئے نگار ہے

ترا سوزِ غم ہے کہ دل مرا یہ معاملہ نہ کبھی کھُلا
جو بھڑک اُٹھے تو وہ شعلہ ہے جو دبا رہے تو شرار ہے

تجھے یوں تو صرصرِ غم کبھی نہ تپاں دلوں سے تھی دشمنی
ترے چلتے ہی وہ کنول بجھے کہ جہان تیرہ و تار ہے

ترے صدمے بلبلِ مضطرب یہ بھرم بھی تجھ پہ کھُلا کبھی
وہی برق ہے وہی آشیاں وہی پھول ہے وہی خار ہے

سب اُسی کے سائے میں پلتے ہیں یہ کرشمے ظلمت و نور کے
یہ ہے تیری نرگسِ نیم وا کہ طلسمِ لیل و نہار ہے

یہ پیامِ دورِ جدید ہے کہ وہ حال و قال کے دن گئے
ترا عشق ہوش ہے سر بسر وہ نشہ ہے نہ خمار ہے

جو یہ گونج سی ہے فضاؤں میں جو لپٹ سی ہے یہ ہواؤں میں
مری شامِ غم کی ہے داستاں کہ یہ بوئے گیسوئے یار ہے

جہاں فیصلہ نہ یہ کر سکیں کہ قدم کو روکیں بڑھے چلیں
وہیں بستے ہیں ترے غمزدے وہی غمزدوں کا دیار ہے

اُسے دین بھی نہ سمجھ سکا اسے کفر بھی نہ پرکھ سکا
کہ طوافِ کعبہ کے پھیر میں ترا عشق بت بہ کنار ہے

تھی ہر اک فصل کی شان الگ مگر اے سیاستِ مغربی
ترے ہاتھوں اُف یہ چمن لٹا کہ خزاں ہے اب نہ بہار ہے

یہ عجیب جاگتا خواب ہے، کبھی جیسے مرگھٹ نظر پڑے
یہ جہان ہے کہ فراق یہ بھی جہانیوں کا مزار ہے

عشق کی دنیا بھی وہ دنیا نہیں ۔۔۔ اب تو تیرا درد بھی اُتنا نہیں

انتظارِ نرگسِ مخمور دیکھ ۔۔۔ اے محبت تیرے بس میں کیا نہیں

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا ۔۔۔ یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے ۔۔۔ اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں

اور کوئی بات ہے وجہِ سکوت ۔۔۔ عشق کو تجھ سے کوئی پردا نہیں

دل کو ہے یونہی سی تشویشِ سحر ۔۔۔ طولِ شامِ غم سے گھبراتا نہیں

تا ابد امروز ہی امروز ہے ۔۔۔ عاشقی میں دوش اور فردا نہیں

خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بےقرار ۔۔۔ غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں

بات کیا ہے آج تیرے جور پر   کیوں جفا کا بھی گماں ہوتا نہیں

موت کا اُف وہ پیامِ زندگی   ایک دنیا نے جسے سمجھا نہیں

درد ہی تو ہے محبّت ہی تو ہے   راز ہی تو ہے اگر کھلتا نہیں

زندگی اے دوست غم کا نام ہے   یہ تو شاید شکوۂ بے جا نہیں

ماورائے درد و راحت ہے وفا   پر کوئی حسّاس بھی اتنا نہیں

ہاتھ ملتے ہیں خدا اور اہرمن   تیرا عاشق دین دُنیا کا نہیں

مائلِ بیداد وہ کب تھا فراقؔ

تُو نے اُس کو غور سے دیکھا نہیں

کتنا ہے سیہ مست اور کس درجہ وہ چنچل ہے ‫ ‫ بجلی ہے تو بجلی ہے بادل ہے تو بادل ہے
پوشاک جھکا جھک ہے ہر عضو میں جھل بل ہے ‫ ‫ بلّور پگھل جائے وہ رنگ جھلا جھل ہے
کیا کچھ نہیں کہہ جاتی یہ نیم نگاہی بھی ‫ ‫ کہنے کو ادھوری ہے پر بات مکمل ہے
یہ شانِ نزاکت ہے کھلتا نہیں کھل کے بھی ‫ ‫ کھنچ آتے ہیں دو عالم رگ رگ میں وہ کس بل ہے
مستی ہیں مرے جلوے نغمے دلِ وحشی کے ‫ ‫ بجلی ہے گھٹاؤں میں جنگل میں بھی منگل ہے
ساقی بھری دُنیا میں خاک اڑتی تھی بے تیرے ‫ ‫ اب ایک ترے ہاتھوں سنسار میں جل تھل ہے
یہ مہر و مہ و انجم ہیں نقشِ قدم کس کے ‫ ‫ لہرائی ہوئی بجلی کس شوخ کا آنچل ہے
کہتے ہیں مکاں جس کو کہتے ہیں زماں جس کو ‫ ‫ وہ حُسن کا آنچل ہے یہ عشق کا اک پل ہے
تھی فکر بہت دل کو پا جائے خوشی کے راز ‫ ‫ کچھ کھو یا ہوا تھا ہی اب سُنتے ہیں پاگل ہے

ہنگامہ ہے ہنگامہ سرتا بقدم کوئی
رکنے میں بھی ہلچل ہے چلنے میں بھی چھل بل ہے

یہ غم یہ مسرت سب افسانہ ہے افسانہ
اے دوست محبت خود اک کیف مسلسل ہے

سوچیں تو عجب نکتہ ہے حسن و محبت بھی
چپ رہیے تو سب واضح کچھ کہیے تو مہمل ہے

سب سنتے ہی آئے ہیں سب کہتے ہی آئے ہیں
افسانہ ہستی کا آخر ہے نہ اول ہے

آجائے جھلک جیسے امروز میں فردا کی
تم آئے تو یہ دن بھی کچھ "آج" ہے کچھ "کل" ہے

شوخی تو فراق اس کی مستی تو فراق اسکی
بجلی ہے تو بجلی ہے بادل ہے تو بادل ہے

اِک ذرا عشق سُبک روح گرانبار سہی
نگہِ ناز میں کچھ شرم کے آثار سہی

تیرے ناکام اب اس درجہ بھی ناکام نہیں
کامرانی بھی ترے عشق میں بے کار سہی

بے خبر عشق میں جینے کے لئے جلدی کر
جان دینے کے لئے فرصتِ بسیار سہی

اور کچھ مصلحتیں شکوہ بیداد کی تھیں
خیر، انکار نہ ممکن ہو تو اقرار سہی

جو سرِ بزم چھلک جائے وہ پیمانہ ہے
یوں تو گردش میں کئی ساغرِ سرشار سہی

تُو نے جادو کا جگانا بھی کبھی دیکھا ہے
آج وہ آنکھ نہ بیدار نہ ہشیار سہی

گردِ رہ سے وُہ زیادہ نہیں، گو منزلِ عشق
کوہ و صحرا ہی، زنداں سہی، گلزار سہی

نگہِ شوق میں پھر بھی ہیں ترے ہی جلوے
نہ سہی دید، تری حسرتِ دیدار سہی

تیری آہستہ خرامی بھی سکونِ دل ہے
اِس روش میں بھی تری شوخیٔ رفتار سہی

قتلِ عشّاق کو درکار نہیں کچھ سرِ دست
خمِ ابرو کی لچکتی ہوئی تلوار سہی

زورِ تدبیر سے تقدیر پلٹ جاتی ہے
زندگی بارِ غلامی سہی، بیگار سہی

رشکِ فردوس بنا لے گا جہنم کو بھی عشق
تیرے فردوس میں ہر کافرو دیندار سہی

اِس قدر عشق نہیں زندہ دلی سے محرُوم
تجھ سے مایوس ہی، زیست سے بیزار سہی

کون اسرارِ محبت کو مگر سمجھائے
ترے انکار سے پیدا ترا اقرار سہی
عالمِ قدس کی پڑتی ہیں انہیں پر چھوٹیں
حُسن بدمست سہی عشق سیہ کار سہی
کچھ نہ کچھ ہوش تو لازم ہے سرِ بزمِ جہاں
عشق کی بے خبری محرمِ اسرار سہی
کاروانوں کو وہ گُم راہ نہ ہونے دے گا
عشق کی آخری منزل رسن و دار سہی
دُکھ گئیں چند رگیں، بول اُٹھا سازِ بہار
فتنہ پردازِ چمن گل نہ سہی، خار سہی
پھر بھی ہے قابلِ تعزیر کہ مجرم ہے فراقؔ
ہم نے مانا کہ محبت کا گنہگار سہی

بزمِ مے ہے کہ سیہ خانہ ہے تجھ بن ساقی — موجِ بادہ ہے کہ دُود اُٹھتا ہے پیمانوں میں

خندۂ صبحِ ازل تیرگیِ شامِ ابد — دونوں عالم ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

وحشتیں بھی نظر آتی ہیں سرِ پردۂ ناز — دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں

ایک رنگینیِ ظاہر ہے گلستاں میں اگر — ایک شادابیِ پنہاں ہے بیابانوں میں

یہ جو ہر غنچہ و گل میں ہے اِک اندازِ جنوں — کچھ بیاباں نظر آئے ہیں گریبانوں میں

اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گل بھی نہ رہے — اب وہ آثارِ جنوں بھی نہیں دیوانوں میں

اب وہ رات جب امیدیں بھی کچھ تھیں تجھ سے — اب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں

تا کجے وعدۂ موہوم کی تفصیل فراقؔ

شبِ فرقت کہیں کٹتی ہے اِن افسانوں میں

پارسائی زاہدوں کی مستیاں میخوار کی
وہ فقط حسرت یہ کیفیت ترے دیدار کی

اپنا سر اپنا مقدر اپنی آنکھیں اپنا دل
حسرتیں رہ جائیں کیوں قاتل ترے دیدار کی

کنجِ زنداں میں تو مجھکو وسعتِ صحرا کی یاد
حسرتیں زنداں میں صحرا کے در و دیوار کی

اب یہ مجبوری ہو یا ہو بے نیازی یا امید
بھولتی جاتی ہیں یادیں حُسن کے اقرار کی

آہ اے دردِ فراقِ یار اے جانِ فراق
کیفیت تجھ میں ہے اک بھولے ہوئے اقرار کی

فیضِ دستِ کرمِ ساقیِ دلبر سے اُٹھا
شعلہ سا دیکھ وہ کچھ کسوتِ ساغر سے اُٹھا

شوخیِ برقِ نگہ بھی ہو بہ اندازِ سکوں
شرط چلنے کی بھی چلتے ہوئے نشتر سے اُٹھا

دلِ حیراں پہ نگاہِ غلط انداز پڑی
پردہ سا حُسنِ رُخِ آئینہ پیکر سے اُٹھا

دردِ آغوشِ محبت بھی ترے اُٹھتے ہی
اُسی انداز، اُسی ناز، اُسی تیور سے اُٹھا

نہ تو پُرسش کی شکایت نہ عنایت میں کمی
جو اُٹھا بزم سے وہ اپنے مقدّر سے اُٹھا

جان ہے سادگیِ عشق کی شوخی اس کی
لذتِ لطفِ نہاں جورِ سراسر سے اُٹھا

سرفروشانِ سیہ بخت کی قسمت چمکی
شعلہ سا سنتے ہیں کچھ سینۂ خنجر سے اُٹھا

مستی و ہوش تو ساقی فقط افسانے ہیں
یہ حجابات بھی اب بادہ و ساغر سے اُٹھا

سر بسر برقِ فنا عشق کی ہستی تھی فراقؔ
آنکھ پڑتے ہی دھواں دامنِ محشر سے اُٹھا

نگاہِ مست سے دیکھو تو مسکرا دینا   کسی کے اُڑتے ہوئے ہوش اُڑا دینا

خراب حال نہیں خاک تیرہ بختوں کی   تڑپ اُٹھے تو اُسے آئینہ بنا دینا

بصد حجابِ چمن میں وہ تیری انگڑائی   یہ رنگ دیکھ کے غنچوں کا مسکرا دینا

جمالِ یار کے وحشت زدوں کو دو یہ پیام   کوئی ہے؟ طور کے ذرّے ذرا اُڑا دینا

یہ اتفاق عجب ہے یہ انقلاب عجب   مجھے بھلا کے مری یاد بھی بھلا دینا

گناہگارِ محبت گناہگار نہیں   جزا بھی رشک میں آجائے وہ سزا دینا

یہ ناشکیبیٔ دل سے ہے قولِ ضبطِ فراق
متاعِ درد بھی اس طرح کیا لٹا دینا

گل و گلزار ہیں پر تو ترے رخساروں کے — کیا شرارے ہیں دہکتے ہوئے انگاروں کے

ساقیا صدقے دہکتے ہوئے انگاروں کے — کیا لپٹ مارتے ہیں دل ترے میخواروں کے

بزمِ فطرت کا جمال آئینہ در آئینہ ہے — دُور تک ختم نہیں سلسلے نظاروں کے

تری رفتار سے آتی ہے زمانے میں بہار — قدم اُٹھتے ہیں کہ دن پھرتے ہیں گلزاروں کے

ٹکڑے ٹکڑے ہیں جگر دیکھ کے ابرو کی لچک — کب خطا ہوتے ہیں تیر ایسے کمانداروں کے

خون وہ جس کو کہیں جلوہ دہِ دار و رسن — یونہی چمکا دے ذرا جرم خطاواروں کے

کوچۂ یار دو عالم میں نہیں تیری مثال — رشکِ فردوس ہیں سائے تری دیواروں کے

کیا کرینگے وہ تری دوزخ و جنت لے کے — دیکھ تیور تو ذرا اپنے گنہگاروں کے

حُسنِ گلزار بھی ہے تیرا کرشمہ قاتل — زخم ہیں لالہ و گل بھی اپنی تلواروں کے

کچھ سمجھ میں اگر آتا تو فرشتے لکھتے — صاف ہیں نامۂ اعمال سیہ کاروں کے

خوں کا گھونٹ محبت میں اتارا تھا کبھی — مزے لیتے ہیں ابھی کام و دہن یاروں کے

کوئی حد بھی ہے پئے جائیں کہاں تک ہم رند — ہم تو بس ہو گئے واعظ تری بوچھاروں کے

اُنہیں دھکیا[۱] کے بڑھیں قافلے والے آگے — قدم اُٹھتے ہیں غلط قافلہ سالاروں کے

اہلِ دنیا کو تری یاد دلا جاتے ہیں — دُور تک پھیلے ہوئے سلسلے کہساروں کے

گریۂ شام کہاں اب مگر اِن آنکھوں میں — عکس پڑ جاتے ہیں کچھ چھٹکے ہوئے تاروں کے

چارہ گر اتنے نہ بے بس نظر آتے تھے فراقؔ
آج اندازِ سکوں اور ہیں بیماروں کے

شام بھی تھی دھواں دھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

[۱] یعنی دھکا دے کے

وفورِ شوق کو شانِ جمال راہ تو دے
یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ تو دے

رہیگا کُھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیِ نگاہ تو دے

جو دل ہی بیٹھ چلا ہو تو ذکرِ ساحل کیا
یہ ناؤ ڈوب کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

ترا وصال سہی عالمِ شہود سہی
نشاں مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

اِک آہِ سرد سہی اک نوائے درد سہی
یہ ضبطِ غم کبھی بیچارگی کو راہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں
کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ تو دے

رہی ہے راز سراسر اگرچہ فطرتِ حسن
ہوا کسی کو مگر دامنِ نگاہ تو دے

بتائے کون خموشی کو داستاں ہونا
کہ یہ پیامِ نہاں نے تری نگاہ تو دے

بقدرِ ہمت دل ڈوبنا مبارک ہو
اُترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

ایک آنکھوں کا اثر، تاثیر اک رفتار کی
موجِ مے کا لڑکھڑانا بے خودی میخوار کی
پارسا کی پارسائی مستیاں مے خوار کی
وہ فقط حسرت، یہ شان و کیفیت دیدار کی
کنجِ زنداں میں تو مجھ کو وسعتِ صحرا کی یاد
حسرتیں صحرا میں زنداں کے در و دیوار کی
بن چکے ہیں وصل و فرقت اک پیامِ بیخودی
مل چکی ہیں سرحدیں اقرار سے انکار کی
کیا کہیں، کیونکر کہیں، کیا ہے وہ چشمِ نیم باز
مست کی مستی بھی ہشیاری بھی ہے ہشیار کی
حسنِ رسوا۔ اور رسوائے جہاں ہوتا رہے
تھی یہی ساری حقیقت نکہتِ گلزار کی

دُکھتے دل سے نغمۂ سازِ محبّت چھیڑ دے
آپ رُک جائیں گی بحثیں کافر و دیندار کی
جن کی تاثیرِ دل سے اہلِ دہر کی آنکھیں کھلیں
غفلتیں تھیں کچھ وہ تیرے محرمِ اسرار کی
آشتی جس پر تصدّق، دوستی جس پر نثار
وہ چڑھی تیوری تھی اک آمادۂ پیکار کی
آہ! اے دردِ فراقِ یار اے جانِ فراق
کیفیّت تجھ میں ہے اِک بھولے ہوئے اقرار کی

کس درجہ سکوں نما ہیں ابرو کے ہلال
خیر و برکت کے دھن لٹاتی ہوئی چال
جیون ساتھی کے آگے دیوی ہو کر
آتی ہے سہاگنی سجائے ہوئے تھال

نہ جانے آج اہلِ شوق کیوں بیٹھے ہیں گُم سُم سے
نہ اپنے آپ سے مطلب نہ کوئی واسطہ تم سے

بہ یک آہنگ کیا کیا حُسن کے جلوے نظر آئے
تبسّم سے، تکلّم سے، ترنّم سے، تلاطم سے

مری نذرِ محبت پیاری پیاری جھوٹی باتیں ہیں
نہ ہوتا گر خلوص اتنا تو میں سچ بولتا تم سے

ستارے اشک بھر لاتے تھے راتیں مسکراتی تھیں
کہیں کوئی مرے اشعار پڑھتا تھا ترنّم سے

یہی دل ہے کہ خاک اُڑتی تھی کل تک آج اسی دل کو
گلستاں در گلستاں کر دیا موجِ تبسّم سے

یہ نازک وقت! یہ عشقِ نشاط آگیں! اتنا مت سے
نہ کوئی آس دُنیا سے نہ کوئی آسرا تم سے

اسی دُنیا کے کچھ نقش و نگار اشعار ہیں میرے
جو پیدا ہو رہی ہے حق و باطل کے تصادم سے

وہ موجِ بوئے مے تھی ساقیا یا خواب تھا کوئی
یہ دیکھا صاف مستوں نے اُڑی ہے اک پری خُم سے

نگاہیں دیکھتی ہیں اک نئی دنیا کے دَر کھلتے ...
بظاہر بیٹھے رہتے ہیں فراقؔ ان روزوں گُم سُم سے

خود کو کھویا بھی کہاں عشق کو پایا بھی کہاں
ختم ہو دیکھئے تیرا سر و سودا بھی کہاں

رنج و راحت سے بہت دور ہے عشق مجبور
آج پہونچی ہے تری رنجش بیجا بھی کہاں

بجر پیہم سے ترے چھوٹ رہے ہیں - لیکن
آج ہم اہلِ وفا پائیں گے ایسا بھی کہاں

نام بدنام ہوا مفت میں بدنامی کا
ہو سکا کوئی ترے عشق میں رسوا بھی کہاں

اہلِ دل جس کو تری برقِ نظر کہتے ہیں
ہاں وہ اندازِ فنا عشق کو آیا بھی کہاں

ضبط کی تاب نہ تھی پھرتے ہی وہ مستِ نگاہ
آج پیمانۂ دل ہاتھ سے چھوٹا بھی کہاں

مشکلیں عشق کی پا کر بھی تجھے کم نہ ہوئیں
اتنا آسان ترے ہجر کا غم تھا بھی کہاں

ایک ہی کام ہوا یعنی ترا نظّارہ
نگہ شوق نے لیکن تجھے دیکھا بھی کہاں

یہ بھی سچ ہے کہ ترے جور نہیں کچھ ایسے
یہ بھی سچ ہے کہ محبت کا زمانا بھی کہاں

آج ساقی کی نظر اِک نئی دنیا سے لڑی
میکشو ساغرِ سرشار یہ چھلکا بھی کہاں

میں یہ کہتا ہوں کہ افلاک سے اونچا ہوں بہت
عشق کہتا ہے ابھی دردِ دل اُٹھا بھی کہاں

تذکرہ اِس نگہِ مست کا دل والوں میں
دوستو چھیڑ دیا تم نے یہ قصّا بھی کہاں

چھوٹ پڑتی ہے سرِ عرش بریں کوسوں تک
آج چمکا ہے ترا حسن خود آرا بھی کہاں

اہلِ دل حسن پہ الزامِ ستم کیا دھرتے
اُس کا پیمانِ وفا یاد اُنہیں آتا بھی کہاں

کاوشیں زندگی و موت کی سچ ہے، نہ گئیں
در وہ تیری نگاہوں نے اُٹھایا بھی کہاں

جیسے کچھ چونک پڑیں سوئی ہوئی تقدیریں
آج ہوتا ہے اِن آنکھوں کا اشارا بھی کہاں

فیصلہ عشق کی تقدیر کا ہونا معلوم
آپ نے کچھ مگر اِس باب میں سوچا بھی کہاں

ہم نے مانا کہ غمِ ہجر بھی دھوکا ہے فراق
اور اگر غور کریں دل میں تو دھوکا بھی کہاں

کتبہ: عباسی لاہور ۴۵ ر

حیات بھی نہ ہو معراجِ آسماں و زمیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

جو بھولتی بھی نہیں، یاد بھی نہیں آتی
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

لبِ نگار ہیں یا نغمۂ بہار کی لَو
سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطربِ رنگیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب
تمہیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں

ابھی فضاؤں میں تو انقلاب پلتا ہے
زمیں بھی بپھری ہوئی سی فلک بھی چیں بہ جبیں

بس اِک فسانہ یہ اندازِ عشق و شانِ جمال
بس ایک خوابِ پریشاں یہ شورشِ نمکیں

ہر اک ابد کا مسافر، ہر ایک خانہ بدوش
سرِ دیارِ محبّت کوئی مکاں نہ مکیں

نگاہِ ناز تری کافری کو پا نہ سکے
ہزار قبلۂ ایماں، ہزار کعبۂ دیں

وہ جس نے اہلِ محبت کے ہوش اڑائے تھے
نگاہِ ہوش ربا تھی نہ گیسوئے مشکیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تُو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی اُمیدیں تھیں

جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گُل
تری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اُڑیں

خدا کے سامنے میرے قصور وار ہیں جو
برابر اُن سے نگاہیں مری نہیں ہوتیں

مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا — کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حُسن بھی حزیں ہے
ہُنر تو خیر، ہُنر عیب سے بھی جلتے ہیں — فغاں کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

چمک کر حُسنِ عالم، عالمِ وحدت نہ ہو جائے
کہیں دُنیا کی ہر صُورت تری صُورت نہ ہو جائے

تری آنکھیں زمانے کے بدلنے کی کہانی ہیں
محبّت بھی انہیں آنکھوں کی کیفیّت نہ ہو جائے

بجائے خلد وعدہ رکھ بھروسا سچّی دُنیا پر
مرا ذمہ جو دُنیا رشکِ صد جنّت نہ ہو جائے

ہزاروں مشعلیں گُل کر چلا ہے وقت کا دامن
ترا یہ نورِ ایماں سر بسر ظُلمت نہ ہو جائے

محبت میں بدلتا جا رہا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں
فراقؔ آغاز میں جو تھی وہی حالت نہ ہو جائے

فسردہ پا کے محبّت کو مسکرائے جا
اب آ گیا ہے تو اِک آگ سی لگائے جا

اِس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

جہاں کو دے گی محبّت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

مِٹا مِٹا کے محبت سنوار دیتی ہے
بگڑ بگڑ کے یُونہیں زندگی بنائے جا

وہ کیمیا ہی سہی، پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوزِ نہانی کی آنچ کھائے جا

ابھی تو اے غمِ پنہاں، جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا

کُھلیں نہ حُسن کی فطرت کے راز، عاشق سے
برت خلوص بھی، جھُوٹی قسم بھی کھائے جا

خلوصِ عشق کو کرنا دوائے غفلت و ہوش
کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا

شباب پر ہے زمانہ، ترے ستم کے نثار
اُبھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا

فراقؔ چھیڑ دیا تُو نے کیا فسانۂ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سُنائے جا

کچھ اپنا آشنا کیوں اے دلِ ناداں نہیں ہوتا
کہ آئے دن یہ رنگِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچہ خنداں نہیں ہوتا

یقیں لائیں تو کیا لائیں جو شک لائیں تو کیا لائیں
کہ باتوں میں تری سچ جھوٹ کا امکاں نہیں ہوتا

سکوں ناآشنا رہتے ہیں رو کر بھی ترے وحشی
کہ دامانِ بیاباں، دامنِ جاناں نہیں ہوتا

قسم تیری، تجھے پا کر بھی تجھ کو پا نہیں سکتے
یہ عُقدہ حل بھی ہو کر عقدۂ آساں نہیں ہوتا

خلوصِ عشق برحق، دیدۂ پُرنم بجا، لیکن
غمِ ہجراں بھی سُنتے ہیں غمِ جاناں نہیں ہوتا

نگاہِ اہلِ دل کے انقلاب آئے ہیں دُنیا میں
یقیں رکھ عشق اتنا بے سر و ساماں نہیں ہوتا
فضائل لاکھ ہوں، لیکن محبّت ہی نہیں جس میں
فرشتہ ہو، خدا ہو، کچھ بھی ہو، اِنساں نہیں ہوتا
نگاہیں آشنا کیوں جان کر انجان بنتی ہیں
کئے جا اپنی سی تدبیر میں شاداں نہیں ہوتا
اُمڈ آئے جو آنسو انقلاب اِس کو نہیں کہتے
کہ ناداں ہر تموّج بحر کا طوفاں نہیں ہوتا
فراقؔ اِک اِک سے بڑھکر چارہ سازِ درد ہیں لیکن
یہ دُنیا ہے، یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

دلِ افسردہ کے اب وہ وقت کی گھاتیں نہیں ہوتیں
کسی کا درد اُٹھے جن میں وہ راتیں نہیں ہوتیں

ہم آہنگی بھی تیری دُوریٔ قربت نما نکلی
کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں

یہ دورِ آسماں بدلا کہ اب بھی وقت پر بادل
برستے ہیں مگر اگلی سی برساتیں نہیں ہوتیں

زبان و گوش کی ناکامیوں کا کچھ ٹھکانہ ہے
کہ باتیں ہو کے بھی تجھ سے کبھی باتیں نہیں ہوتیں

وہ عالم اور ہی ہے جس میں گہری نیند آتی ہے
خوشی اور غم میں سونے کیلئے راتیں نہیں ہوتیں

اے واعظ! تری رسمِ عبادت میں دھرا کیا ہے
نگاہیں اہلِ دل کی کب مناجاتیں نہیں ہوتیں
سمجھ کچھ رازِ حسن و عشق کے شبہائے فرقت میں
کہ رونے کیلئے یہ دکھ بھری راتیں نہیں ہوتیں
سبب کچھ اور ہے یا اتفاقاتِ زمانہ ہیں
کہ اب تجھ سے بھی پہلی سی ملاقاتیں نہیں ہوتیں
فراقؔ اس دور کے اہلِ نظر سے ہے پیام اپنا
حقائق ہوتے ہیں اشعار میں باتیں نہیں ہوتیں

بلائے ناگہانی بھی پیامِ زندگانی بھی —
قیامت ہے قیامت یہ تری اٹھتی جوانی بھی
مٹا کر ہم کو مٹ جاتا ہے غم بھی شادمانی بھی
ازل ہی سے ہے یہ دنیا حقیقت بھی کہانی بھی
پہاڑوں کی ہے سختی تو گذر اسمیں ہے دنیا کا
ملا وہ دل محبت کو جو پتھر بھی ہے پانی بھی
نہ پائی راہ دل میں گو غمِ دنیا نے بھی، لیکن
کہاں ہے آج ایسی تیرے غم کی پاسبانی بھی
غمِ دوراں کا رکھ کچھ دھیان اپنا غم سنانے میں
کہ اک دن ختم ہو جائیگی ناداں یہ کہانی بھی
خطِ تقدیر اپنا پڑھ چکا ہوں بارہا لیکن
نگاہِ یار! آخر کوئی پیغامِ زبانی بھی

گلستاں در گرہ لب شبستاں در کنار آنکھیں
کہ ہے صبح بہاراں اس کا غم بھی شادمانی بھی

نگاہوں کا وہ عالم دیدنی ہے جب چھلکتی ہے
کسی کی نرگسِ معصوم میں کچھ بدگمانی بھی

ہمیں غش کھا گئے ہیں شعلۂ آوازہ پر اپنے
ہمیں نے بارہا دی ہے صدائے لن ترانی بھی

عجب کیا اہل عالم اب اگر ہمدرد ہو جائیں
کہ کچھ کم ہو چلا ہے سوزِ غم ہائے نہانی بھی

نگاہِ ناز کے اُٹھتے ہی اے رنگ رُخِ جاناں
چھلکنا سیکھ لے تجھ سے شرابِ ارغوانی بھی

فراقؔ اس دور کو دورِ عمل کہتے تو ہیں لیکن
رہے گی یاد دنیا کو تری جادو بیانی بھی

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبّت کا بھروسا بھی نہیں

بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کیا مگر راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

ایک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبّت نہیں کہتے اے دوست!
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

فطرتِ حُسن تو معلوم ہے تجکو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

نگہِ ناز کی نیّت کا پتہ بھی نہیں اور
دلِ دیوانہ کا معلوم ارادا بھی نہیں

بے خودی ہوش نما ، ہوش بھی غفلت آرا
اِن نگاہوں نے کہیں کا مجھے رکھا بھی نہیں

یُوں تو ہنگامے اُٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست ! کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بیباک
کہ اُٹھانا حدِ آدابِ تماشا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اِس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دلِ ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

ہم اُسے مُنہ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراق
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

عشق کے ہاتوں دل وجاں شاد ہیں آباد ہیں
رہ گئیں تیری جفائیں وہ بھی کچھ کچھ یاد ہیں
عشق والوں کی نہ پوچھو شاد ہیں آباد ہیں
سو طرح آباد ہو کر سو طرح برباد ہیں
بس انہیں کے فیض سے ویرانیاں آباد ہیں
ہر ادائے حسن ہیں سو عالمِ ایجاد ہیں
زندگی پر ایک تہمت ہے یہ نظمِ زندگی
عشق پر جس طرح سب الزام بے بنیاد ہیں
آج تک خونِ تمنّا سے بسی ہیں جنّتیں
تیرے اُٹھتے درد سے سینے ابھی آباد ہیں
کیا عجب نکلے جو کارِ حسن بھی کارِ دراز
ہم اسیرانِ ستم قیدی بے بنیاد ہیں
یہ جھکی نظریں تری یہ زیرِ لب باتیں تری
داستاں در داستاں رُوداد در رُوداد ہیں

دُنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے آج

وہ سر اُٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج

کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

یکسر جہانِ حُسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج

ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے
کیا شے ہوائے دہر کو سنکا رہی ہے آج

ابنائے دہر لیتے ہیں یُوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج

پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو
پھر آتشِ خموش کو اُکسا رہی ہے آج

برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے اِن دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اِک موجِ دُود سینے میں لرزاں ہے اِس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروزِ پر فراقؔ
ہر چیز اِک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

دل میں اُٹھا کے رکھ لے گُلستاں　　کر لے علاجِ تنگیٔ داماں
شبنم و شعلہ حُسنِ گلستاں　　پُرنم پُرنم، سوزاں سوزاں
آئے گنہگارانِ محبّت　　نادم نادم، نازاں نازاں
یہ بھی فسانہ، وہ بھی کہانی　　کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
آنچ قفس والوں تک آئی　　اب کے بہت ہے شورِ بہاراں
کِس کے پاؤں کی چاپ ہے دُنیا　　کون ہے صُبحِ ازل سے خراماں
کِس نے موت کی نیند اُڑا دی　　جاگ اُٹھی ہے خاکِ شہیداں

یُوں ہی فراؔق نے عُمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

کچھ ہم بھی تو حسرتیں نکالیں
آؤ تمہیں سینے سے لگالیں

جس طرح گہن سا لگ کے چھٹ جائے
ہاں پھر یونہی روٹھو ہم منالیں

یہ ذلتِ عشق تیرے ہاتھوں
اے دوست تجھے کہاں چھپالیں

اسرارِ جہاں بھی کھل رہیں گے
ان آنکھوں کا پہلے بھید پالیں

پھر کھالیں گے فریبِ ہستی
کچھ تیری نظر کے دھوکے کھالیں

کیوں دل میں امید کو جگہ دیں
کیوں سانپ کو آستیں میں پالیں

گم ہوگئے اپنی حسرتوں میں
ہم چل گئے اس نظر سے چالیں

اک ہستیٔ ناتواں ہوں لیکن
کونین بھی زور آزمالیں

چپ چاپ بدل گئی ہے دنیا
ملتی ہیں کچھ اس کی بھی مثالیں

کچھ دن غمِ ہجر میں بھی کاٹیں
کچھ یوں بھی تو زندگی گنوالیں

رونے کو تو زندگی پڑی ہے
کچھ تیرے ستم پہ مسکرا لیں

غزلیں مری سن کے اہلِ دُنیا
اپنی کھوئی حیات پا لیں

وہ چشمِ عتاب مسکرائی
بگڑی ہوئی بات اب بنا لیں

برسوں ترے غم ہیں رو چکے ہم
اب اور بھی کام دیکھیں بھالیں

اب تم کو نہ منہ دکھائینگے ہم
کیا چاہتے ہو قسم ہی کھا لیں

ڈگمگ ڈگمگ نظامِ ہستی
ہم خود کو فراقؔ کیا سنبھالیں

اہلِ دل کچھ اُس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں، داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے، دکھتی رہے
یونہی اُس کے جا و بیجا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے، جو ہے پیامِ زندگی
اس سکوتِ راز، اُس آواز کی باتیں کرو

عشق بے پروا بھی اب کچھ ناشکیبا ہو چلا
شوخیٔ حسنِ کرشمہ ساز کی باتیں کرو

جو حیاتِ جاوداں ہے جو ہے مرگِ ناگہاں
آج کچھ اُس ناز اُس انداز کی باتیں کرو

کس لئے عذرِ تغافل کس لئے الزامِ عشق
آج چرخِ تفرقہ پرواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا، بیزار سا
آج اس کی نرگسِ غمّاز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نُور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

نام بھی لینا ہے اک جہانِ رنگ و بُو
ہمدمو اُس نو بہارِ ناز کی باتیں کرو

عشق کی کایا پلٹ دی جس کی فرقت نے فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرو

دل میں کچھ غم ہے کچھ سرور بھی ہے   کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

یہی کہتے ہیں اپنے دیدہ و دل   ترا چھپنا ترا ظہور بھی ہے

بن کے نقشِ قدم ابھرتا ہوں   شاملِ عجز کچھ غرور بھی ہے

موت کو موت تو نے سمجھا ہے   خودکشی کا تجھے شعور بھی ہے

کھو گئے ہیں اسی میں شمس و قمر   عشق ظلمت ہے عشق نور بھی ہے

یوں بھی مشکل ہے کچھ سکوں پانا   عشق کی مصلحت سے دور بھی ہے

کیا بتائیں تجھے کہاں ہے فراقؔ

تجھ سے چھپ کر ترے حضور بھی ہے

کیا عشق کو ترک ہم کریں گے — ایسا نہ تری قسم کریں گے

برباد دلِ خرابِ غم کو — تو نے نہ کیا تو ہم کریں گے

وابستہ جنوں کے سلسلے کو — اُس زلف سے خم بہ خم کریں گے

افسردہ فضائے زندگی کو — اک عالمِ کیف و کم کریں گے

جاتا ہے نگاہِ یاس پر کیوں — تیغ اُٹھنے دے سر بھی خم کریں گے

ہر دل میں تری جھلک دکھا کر — ہر جام کو جامِ جم کریں گے

اِک شام فراق صبح کر لیں
ہستی کو تو کیا عدم کریں گے

بھڑکتے شعلوں سے ٹھنڈک جو دے وہ آگ ہے تو
سدا بہار ہے تو، پریم کا سہاگ ہے تو

خبر دلوں کو نہیں، جلتے ہیں کہ بجھتے ہیں
ارے نہ آگ نہ پانی ہے جو وہ لاگ ہے تو

سکوت کو بھی تو کانوں میں گونجتا پایا
جو ایک کر دے سنا ان سنا وہ راگ ہے تو

قبائے تنگ نے بیسوں جگہ سے لَو دیدی
ز فرق تا بقدم اک دبی سی آگ ہے تو

میں تجھکو دیکھ رہا ہوں کہ کان بجتے ہیں
ہے کوئی شعلۂ لرزاں کہ کوئی راگ ہے تو

نگاہ و گوش کی پر کیف تشنگی کو نہ پوچھ
اک ادھ کھلی سی کلی، ادھ سنا سا راگ ہے تو

فراق اپنے دکھوں کو بھلا کے کہنا تھا
سدا بہار ہے دنیا، سدا سہاگ ہے تو

دعا سب کرتے آئے ہیں، دعا سے کچھ ہوا بھی ہو
دکھی دنیا میں بندے اَن گنت، کوئی خدا بھی ہو

یہی ہے حُسن کی خوبی، یہی ہے شانِ محبوبی
ز سرتاپا تغافل ہو کوئی، جانِ وفا بھی ہو

نہ پُوچھ اے ہمنشیں یہ جنس مہنگی ہے کہ سستی ہے
یہ دل کی طرفگی ہے خاک بھی ہو کیمیا بھی ہو

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے
کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے کوئی تیسرا بھی ہو

حیاتِ نو بنو کے عالمِ رنگیں کا کیا کہنا
خوشی کی سربسر تصویر بھی ہو غم نما بھی ہو

یہ کہتے ہیں کہ رہتے ہو تمہیں ہر دل میں دکھ بنکر
یہ سُنتے ہیں تمہیں دنیا میں ہر دُکھ کی دوا بھی ہو

اسی کو حُسن کہتے ہیں اسی کا نام ہے مستی
جو لہرائی ہوئی بجلی ہو متوالی گھٹا بھی ہو

تو پھر کیا عشق دنیا میں کہیں کا بھی نہ رہ جائے
زمانے سے لڑائی مول لے تجھ سے بُرا بھی ہو
فسونِ خامشی سے عشق کو چونکا دیا کس نے
تعجب ہے سکونِ شامِ غم بانگِ درا بھی ہو
محبت کی نظر چشم و چراغِ بزمِ ہستی ہے
جب اتنی صورتیں ہیں کوئی صورت آشنا بھی ہو
اجیرن ہو کے بھی یہ زندگی ترسا ہی جاتی ہے
کریں کیا ظرف سے بادہ جو کم بھی ہو سوا بھی ہو
فراقؔ انسان سے کیا فیصلہ ہو کفر و ایماں کا
یہ حیرت خیز دُنیا جب خدا بھی ماسوا بھی ہو

کم یاب سہی نایاب سہی گمنام سہی بے نام سہی
تاثیرِ محبّت کچھ بھی سہی پر کیا وہ عالمگیر نہیں

اکثر راتوں کو یہ کہہ کہہ کر اِک درد کا مارا روتا ہے
سچ ہے کہ محبّت سے بڑھکر دنیا میں کوئی تقصیر نہیں

مانا کہ نگاہ بھی قاتل تھی مانا کہ اُٹھی بھی تیری طرف
ہاں ہم نے تو یہ بھی مان لیا کچھ اِس میں تری تقصیر نہیں

جب دونوں باہم روٹھ چکے اُس وقت کہیں یہ راز کھلا
تقصیر مری تقصیر نہیں تعزیر تری تعزیر نہیں

ذرّاتِ پریشاں پہ دل کے اے مہر و ماہ اک عالم ہے
اور یوں تو چمکنے کو چمکی کس ذرّے کی تقدیر نہیں

سرد ہے ہر سازِ صبح بزمِ عشرت ہو چکی
اب نسیم اس کو سلا دے شمعِ سوزاں رو چکی

دل میں شکووں کا تلاطم، آنکھ لبریزِ سرشک
گر یہی رنگِ طبیعت ہے، محبت ہو چکی

نرم تر گل کی رگوں سے اور دلِ انجم شگاف
وہ نظر راہِ محبت میں جو کانٹے بو چکی

شبنمستاں اِک تبسّم زار بن جانے کو ہے
شامِ غم کے آنسوؤں سے ہر کلی منہ دھو چکی

گونجتا ہے اِس نظر کا نغمۂ زہرہ گداز
راگنی غم اور خوشی کی بے صدا بھی ہو چکی

اب تو بالائے افقِ تقدیرِ انساں مسکرائے
مدتوں نوعِ بشر پر چشمِ انجم رو چکی

وہ سرک آئی جبینِ نور پر تاروں کی چھاؤں
گنگنایا پیکرِ رنگیں، جوانی سو چکی

چار سو پُر کیف اُداسی! آؤ کچھ باتیں کریں
رات جتنی رہ گئی ہو، نیند پوری ہو چکی

موت ہی شاید فراقؔ اب اُسکی آہٹ لے سکے
زندگی خود کو تلاشِ زندگی میں کھو چکی

یہ دھج یہ سجل روپ کی جگمگاہٹ   یہ مہکی ہوئی رسمسی مسکراہٹ
زسر تا قدم مد میں ڈوبی جوانی   یہ شب رنگ گیسو فضا کی اُداہٹ
نسیمِ سحر کی طرح نرم گامی   لچکتے ہوئے روپ کی لہلہاہٹ
سرس[1] نرم سنگیت ایک ایک ادا میں   ستاروں کی پچھلے پہر گنگناہٹ
یہ دوشیزہ، رنگین، لہراتا پیکر   شفق کی بوقتِ سحر کپکپاہٹ
جھلک جسم کی شبنمی پیرہن میں   کسی دیپ مالا کی ہے جھلملاہٹ
وہ انگ انگ میں زیر و بم ہے لہو کا   کہ سیّال کوندوں کی ہے تلملاہٹ
دھندلکے میں وہ جوبن بدن کی   ستاروں کی کرنوں کی وہ لپلپاہٹ
وہ لرزیدہ زلفیں وہ عنبر کی موجیں   وہ دھیمی ہواؤں میں کچھ سنسناہٹ
شگفتہ جوانی کی شوخیٔ پنہاں   اک اک عضو کی زیرِ لب مسکراہٹ

[1] رسیلا

یہ رنگیں جمالی، گُلال اُڑ رہا ہے — کہ صبحِ بہاراں کی ہے تھرتھراہٹ

تو وہ بھیرویں ہے، زمیں جاگ اُٹھی — دمِ صُبح ذرّوں کی یہ گُنگناہٹ

یہ ہر سانس کی نرم لے یہ ترنُّم — کہ لیتی ہے ہر راگنی اپنی آہٹ

یہ رس کی پھواریں یہ حسنِ خراماں — دواں شبنمستاں کی یہ جھمجھاہٹ

وہ ہر آن انگڑائی آئی ہوئی سی — وہ ہر وقت کچھ جسم میں کسمساہٹ

پسِ خواب آغوشِ عاشق سے اٹھنا — ڈُھلے صاف جُوڑے کی یہ ملگجاہٹ

اِن اشعار میں دیکھ لے عکس اپنا

وہ ہر مصرعۂ تر میں ہے رسمساہٹ

جذبِ حُسن سے کھنچ کے ہوئی مستی عالم جسم و بدن
جان اور ایمان کا گاہک جسم کا یہ شرمیلا پن
لَو دیے اُٹھتا ہے پیراہن پوچھ نہ کچھ خوشبوئے بدن
لپٹیں یوں آتی ہیں جیسے موجیں مارے بوئے چمن
مست ادائیں بادل بادل، شوخ نگاہیں بجلی بجلی
چال میں بادِ صبا کی لچک سی سنبھلا سنبھلا الھڑ پن
لہرا لہرا سا اُٹھتا ہے رہ رہ کر وہ پیکرِ ناز
دُنیا دُنیا ہے یہ ادا، عالم عالم ہے وہ بدن
ساعدِ سیمیں میں وہ ڈلک ہے، زرّیں کمر میں ایسی لچک ہے
جیسے لَو دیتا ہوا ہیرا، جیسے جھونکا کھائے چمن
عشق رنگیلا حُسن رسیلا، دیکھیے کیا گُل کھلتے ہیں
عشق میں دُنیا کی چالاکی، حُسن میں ایک البیلا پن

اُن میں کہاں یہ رنگ چھلا چھل اُن میں کہاں ہے یہ چھل بل

اور حسینوں کو بھی دیکھا، نام بڑے تھوڑے درشن

بھینی بھینی نگاہ کی خوشبو، پڑجاتی ہے دل میں ٹھنڈک

اُجلے پھول برسا جاتی ہے اُن معصوم آنکھوں کی کرن

موجِ نسیم اس لوچ کو ترسے جسم ہے یا سنگیت کی لے

سر تا پا لہرا ہی لہرا جیسے کوئی گائے ساون

وادی وادی، دریا دریا پیچ و تاب ہیں تیرے لئے

بادِ سحر نے تجھ کو ڈھونڈا صحرا صحرا چمن چمن

لٹکے لٹکے کالے گیسو، گورے گورے لمبے بازو

مل کے رواں ہیں گنگ و جمن، ساتھ خراماں رام و لکھن

ساز وہی جس میں پیدا ہو آپ ہی آپ چڑھاؤ اُتار

آج نہ چھیڑوں گا میں تجکو آپ ہی آپ روٹھ اور من

سازِ نگاہ سے سن لیتے ہیں عشق کی قسمت کا نغمہ

جیسے سنائی دے چھلکے جام میں تاروں کے دل کی دھڑکن

اک تری یاد ایسی ہے جس سے جلوۂ خلد نظر آئے
اک تری یاد ایسی ہے جس سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

آج اس طرح ترے قدموں میں آیا عشقِ خانہ خراب
جیسے دیس بدیس کا کوئی بھولا بھٹکا گھر آئے

وصل کی رات کے کشف و کرامات آئینے میں صبح کو دیکھ
جیسے سہاگ دمک اُٹھے کنوارپن اور نکھر آئے

یوں بھی کبھی دنیا بدلی ہے یوں بھی پلٹی ہیں تقدیریں
سنتے تھے مرنا کام بڑا ہے لوگ یہ کام بھی کر آئے

چہرے روشن تھے محفل میں پھر بھی اداسی چھائی تھی
ایک ہمیں وہ شمعِ وفا تھے بزم میں جو بجھ کر آئے

دھواں دھواں تھی شامِ محبت حُسن بھی تھا کچھ اداس اداس
یوں تھے چشمِ پُرآب ستارے عشق کی جیسے خبر آئے

کھول دئے جس دم بال اس نے خلوتِ راز ہوئی معلوم
مثلِ فضائے نیم شبی وہ گیسو تا بہ کمر آئے

شرم و حیا کم ہوتے ہوتے حسن پہ وہ جوبن آیا
جیسے گھٹا کے چھٹتے چھٹتے چاندنی رات نکھر آئے

خونِ تمنّا کی موجیں ہیں جلوہ دہِ گلزارِ جہاں
اور ذرا تھپیڑیں جو ہوائیں بوئے مئے کوثر آئے

خون میں ڈوبی ہوئی آواز سے ہم نے نکھارا حسنِ حیات
دھندلے نقش و نگارِ جہاں میں رنگِ محبت بھر آئے

موت کی وادی ڈھونڈ رہے تھے آ نکلے لبِ آبِ حیات
عشق کی گمراہی مت پوچھو ہم بھی فراقؔ کدھر آئے

غبارِ راہ ہو کر اُڑتی ہے خاکِ جہاں اب تک
گذرتے جاتے ہیں منزل منزل کارواں اب تک

عدم کی منزلیں بھی آنکھ اوجھل ہو گئیں لیکن
کہیں سے اُٹھ رہا ہے کاروانوں کا دھواں اب تک

بنائے جاتی ہے آبِ خضر اشکِ محبت کو
کئے جاتی ہے کام اپنا حیاتِ رائگاں اب تک

ہے عالم صلحِ کُل کا جلوہ گاہِ ناز میں لیکن
لچک جاتی ہے کچھ رہ رہ کے ابرو کی کماں اب تک

بھرم تیری نگاہوں کا نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا
وہی دل کو یقیں اب تک وہی وہم و گماں اب تک

جنوں دھیما پڑا فرقت کی راتیں کٹ گئیں لیکن
فضاؤں میں ہے رقصاں بوئے گیسو کا دھواں اب تک

نظر کا آنسوؤں میں مسکرانا دل نہیں بھولا
چراغِ خانہ ہے آزردگیٔ شادماں اب تک

وہ کچھ روٹھی ہوئی آواز میں تجدیدِ دلداری
نہیں بھولا ترا وہ التفاتِ سرگراں اب تک

غمِ دوراں کا بس نام آگیا تھا باتوں باتوں میں
فراقؔ اہلِ وفا سے وہ نظر ہے بدگماں اب تک

تجھ پہ کھلیں کچھ ان آنکھوں کی گھاتیں
اے دل وہاں ہیں باتیں ہی باتیں
چاند کی کرنیں تیری نگاہیں
امرت کی برکھا تیری باتیں
بھینی بھینی نگاہ کی خوشبو
مہکی مہکی ان آنکھوں کی باتیں
جھلمل جھلمل چھاؤں ترے دن
جگمگ جگمگ تیری راتیں
دل کی رگوں کی اُف وہ اینٹھن
ٹیڑھی چالیں اُلٹی باتیں
پھونک گئیں کتنے سینوں کو
آگ لگاتی ہوئی برساتیں

ترے جمال سے گاتی ہوئی بہار آئے
تری نگاہ سے جیسے فضا مہک جائے

یہ رنگ و بوئے بدن ہے کہ جیسے رہ رہ کر
قبائے ناز سے کچھ شعلہ سا لپک جائے

ترے خیال کی رنگینیوں کا کیا کہنا
فضا میں جیسے گلابی سی کوئی چھلکائے

کھلے کسی پہ نہ اندازِ جنبشِ گیسو
چھوئے ہوا، تو نہ جانے کدھر سنک جائے

کبھی تو رکھ لے اٹھا کر چمن کلیجے میں
کبھی تو نکہتِ گل سے بھی عشق تھرّائے

ستم کی یاد گر آئے تو آئے ٹوٹ کے پیار
کرم کا دھیان جب آئے تو آنکھ بھر آئے

وہی طریقِ محبت — کہ خضرِ راہ ہے جو
پہنچ کے منزلِ مقصود پر بہک جائے

فریبِ عہدِ محبت کی سادگی کی قسم!
وہ جھوٹ بول کہ سچ کو بھی پیار آ جائے

ترے سلوک سے یا لوک لاج کے کارن
فراقؔ ذکرِ محبت پہ کچھ تو شرمائے

بزم میں آج اُن آنکھوں کا عالمِ بے خودی تو دیکھ
رنگِ فسوں گری تو دیکھ۔ جادوئے سامری تو دیکھ

لے کے دلِ نجوم کو ڈوبی ہے نبضِ کائنات
عالمِ صبحِ زندگی، رات اگر کٹی تو دیکھ

آنکھیں چرائیں جس طرح تارے اندھیری رات میں
غم کی زیادتی تو دیکھ، آنسوؤں کی کمی تو دیکھ

دن تھے نکلتے بیٹھتے، دُور تھی منزلِ خزاں
کلیوں کی سانس اُکھڑ گئی، مانگے کی زندگی تو دیکھ

صحبتِ شب کی داستاں اس میں سمٹ کے آ گئی
پچھلے پہر کو بزم میں شمع کی تھرتھری تو دیکھ

سیلِ سکوں نما ہے یا طرزِ خرامِ انقلاب
چڑھتی ہوئی ندی کا آج عالمِ کم روی تو دیکھ